ISSN 2456-0375
جون ۲۰۱۹

تاریخ ہند:
رائٹ اور لیفٹ کے نرغے میں

rafeeqemanzil.com
/rafeeqemanzil

جلد: ۳۲ | شمارہ: ٦ | جون ۲۰۱۹ء | رمضان المبارک و شوّال المکرم ۱۴۴۰ھ
editor@rafeeqemanzil.com

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation of India, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

غصہ پی لیجئے

محمد اکمل فلاحی

(وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ) (سورہ آل عمران آیت: 134)

''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے. جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔''

غصہ پی جانا قرآن کے نزدیک متقی لوگوں کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر 134 میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس طرح پیاس کی شدت مٹانے کے لیے پانی کا پینا ضروری ہوتا ہے اسی طرح ''غصے کی آگ'' بجھانے کے لیے غصہ کا پینا ضروری ہوتا ہے۔ غصہ نہ پینے کی صورت میں غصہ کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ یہ آگ جہاں بھڑکانے والے کا خون جلاتی ہے وہیں دوسروں کی عزت و آبرو کو بھی خاک میں ملا دیتی ہے۔ غصہ انسان کو بے قابو کر دیتا ہے۔ انسان جب بے قابو ہو جاتا ہے تو وہ ایسی ایسی حرکتیں کر ڈالتا ہے، جنہیں کرنے کے بعد کفِ افسوس ملنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ کیا غصے کی حالت میں ہم حد نہیں پار کر دیتے؟ کیا غصے کی حالت میں ہم اپنی زبان کو بے لگام نہیں چھوڑ دیتے؟ کیا غصے کی حالت میں ہم اپنے والدین، اپنے بھائی بہن، اپنے دوست یار، اپنے رشتہ داروں، اپنے پڑوسیوں، اپنے ماتحتوں، اپنے ملازموں، اپنے خادموں اور اپنے سے کمزور لوگوں کے دلوں کو تکلیف نہیں پہنچاتے؟ انہیں گالی دے کر! انہیں طعنہ دے کر! ان پر تہمت لگا کر! ان پر احسان جتا کر!

کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ:

کوئی ہماری عزتِ نفس مجروح کرے؟ ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائے؟ ہمیں ذلیل و رسوا کرے؟ نہیں، ہرگز نہیں!

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم چھوٹے چھوٹے غصوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے غصے کو پی جایا کریں۔ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں۔ غصے کے انجامِ بد پر ہمیشہ نظر رکھیں تاکہ خود کو اور دوسروں کو غصے کی تباہ کاریوں سے بچا سکیں۔ غصہ پی جانے کے لیے ہم اپنے اندر ایک اہم صفت پیدا کریں۔ وہ صفت ہے ''معاف کر دینا''۔ یعنی اپنے اندر جس قدر ہو سکے دوسروں کو معاف کر دینے کا جذبہ پیدا کریں۔ معاف نہ کرنا ہی دراصل غصہ کو ہوا دیتا ہے۔ اسی لیے آیت مذکورہ میں مومنین کے بارے میں کہا گیا کہ وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

تاریخ ہند: رائٹ اور لیفٹ کے نرغے میں

تاریخ نویسی انسانی علم وفن کے قدیم ترین شعبوں میں سے ایک ہے۔ انسانی شعور کے ابتدائی ایام سے ہی زندگی کے اہم واقعات وحادثات کو دستیاب وسائل کی مدد سے محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ نہ صرف محفوظ کیا جاتا رہا بلکہ ان کی روشنی میں زندگی کی سچائیوں کو تلاش کرنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ البتہ تاریخ کیا ہے، تاریخ نویسی کیا ہے؟ تاریخ کے مطالعہ کی غرض کیا ہے، تاریخ نویسی کا مقصد کیا ہے؟ تاریخ نویسی کا مقصد ہونا بھی چاہیے یا نہیں، یہ چند ایسے سوالات ہیں جو ہمیشہ کسی معمہ سے کم نہیں رہے۔ انسان کی معلوم دانشوارانہ تاریخ میں ان امور پر کبھی اتفاق رائے نہیں رہا۔ ابن خلدون سے لے کر ہیگل اور پروفیسر ٹوائن بی تک مختلف فلسفیوں اور تاریخ دانوں نے آزادانہ طور پر بھی اور اپنے مخصوص افکار ونظریات کی روشنی میں بھی ان سوالات کا جواب تلاش کرنے سعی کی ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تاریخ نویسی کے کم از کم درجن بھر مکاتب فکر وجود میں آچکے ہیں۔ ان غیر معمولی عدم اتفاقات کے باجود کم از کم اس امر میں غیر علانیہ ہی سہی، اکثر تاریخ نویسوں میں بشمول بعض مسلم مؤرخین، یہ اشتراک پایا گیا ہے کہ انہوں نے تاریخ کی اپنے فکر ونظر کے تقاضوں کے تحت تعبیر کی اور ان تعبیروں کے ذریعے اپنے فکر ونظر کی تبلیغ واشاعت کا 'فریضہ' انجام دیا۔ تاریخ نویسی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ماضی کے اہم حادثات وواقعات کی ایمان دارانہ تعبیر وتشریح اور ان کے صحیح اسباب وعلل کی تشخیص کر کے انہیں نسل نو تک منتقل کرنے کا نام ہے۔ یہ انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ عمل ہے جو صحیح طور پر اسی وقت انجام پاسکتا ہے جب کہ تاریخ نویسی برائے تاریخ نویسی ہی مورخین کے پیش نظر ہو۔ لیکن عملاً ایسا ہوا نہیں ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ میں اکثر تاریخ نویسی سے فروغ نظریات کی خدمت لی جاتی رہی ہے۔ پھر تاریخ چوں کہ سیاسی وتہذیبی اعتبار سے غالب اور حکمراں طبقے نے بھی لکھی یا 'لکھوائی' ہے اس لیے یہ جانب داری اور تحریف سے پاک نہیں رہ سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ مجموعہ تضادات کی شکل میں ایک افسانوی ادب بن کر رہ گئی۔ تاریخ کی مثال اب ایک ایسے کباڑ خانے کی ہوگئی ہے جس میں ہر نظریہ کا پرچارک اپنے اپنے نظریہ کے حسب حال 'حقائق' درآمد کرسکتا ہے۔

اقوام عالم میں مسلمان ہی وہ قوم ہیں جو اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخی ورثہ رکھتے ہیں۔ خود ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی شاندار تاریخ موجود رہی ہے۔ یہاں مسلم امراء وسلاطین اور علماء وصوفیاء کی ایک دلکش گلیکسی صدیوں سے موجود رہی ہے جس نے اپنے سیاسی انتظام وانصرام کی مہارت اور علم وحکمت کی روشنی سے ایک زمانے کو فیض یاب کیا ہے۔ تاہم مختلف اقوام اور مذہبی گروہوں کی تاریخ کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ عالمی وقومی سطح پر سب سے منصوبہ بند تحریف (distortion) بھی مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ہی کی گئی ہے۔

سیموئل جانسن نے 1775 میں یہ بات نہ جانے کس تناظر میں کہی تھی کہ "قوم پرستی 'بدمعاش سیاست دانوں' کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔" بات اگر ہندوستان جیسے ملک کی کی جائے جو ایک متنوع اور تکثیری سماج رکھتا ہے، تو صحیح بات یہ ہوگی کہ 'بدمعاش دانشور نما سیاست دانوں' کی اصل پناہ گاہ 'تاریخ' ہوتی ہے اور 'تاریخ میں تحریف' ان کا سب سے کارگر ہتھیار ہوتا ہے۔ جس طرح سماج میں ایک فرد کو بدنام کرنے کے لیے اس کے معاندین اس کے اخلاق وکردار پر گھناؤنے الزامات لگا کر اسے isolate کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو 'غیر' ثابت کرنے (otherization) کے لیے مسلمانوں کی تاریخ کو مشتبہ کرنے اور مسخ کرنے کا کام ادارہ جاتی سطح پر کیا جاتا رہا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کے اس 'کارخیر' کی راہ انگریزوں نے سجھائی تھی جس پر ہندو انتہا پسندانہ تحریکوں نے لبیک کہا، ان کے شانہ بہ شانہ مارکس وادی نظریہ کے علم برداروں نے بھی اس کام میں دانشورانہ جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کا زمانہ یورپ (بطور خاص فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، اسپین) کے خوں ریز استعماری تسلط کا زمانہ رہا ہے۔ 1858 سے 1947 تک ہندوستان بھی برطانیہ کا غلام رہا۔ عالمی سطح پر یورپ کے استعماری اقدامات کی راہ میں اسلام نظریاتی بنیادوں پر حائل ہوسکتا تھا۔ اس لئے اسلام کی کردارکشی یورپ کے استعماری عزائم کی ضرورت تھی۔ ہندوستان میں بھی برطانوی تسلط اسی صورت میں قائم رہ سکتا تھا جب کہ ہندو۔مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کردیا جائے۔ الغرض یہ ہندوستان میں برطانوی سیاست کا تقاضہ تھا کہ یہاں کی ایک قوم کو دوسری کے خلاف ورغلایا جائے۔ اس کوشش سے نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ مقاصد حاصل ہوسکتے تھے بلکہ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہونے والے تشدد اور خوں ریزی کی وجہ سے یوروپ کے خلاف اٹھنے والی صدائے احتجاج کو آسانی سے اسلام کی طرف موڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ عالمی اور قومی سطح پر ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے 'تاریخ کے ہتھیار' کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ سید ابوالاعلی مودودیؒ اس حوالے سے لکھتے ہیں: "دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خون خوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب کہ پیروان اسلام کی

شمشیر خاراشگاف نے کرہ زمین میں ایک تہلکہ بر پا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہوسکتا تھا، کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن وامان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین وآرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کہیں ان تمام مؤرخانہ تحقیق وتفتیش اور عالمانہ بحث واکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت وناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔'' (الجہاد فی الاسلام)

ہندوستان میں بیسویں صدی کے ربع ثانی میں ہندو مہا سبھا جیسی ہندو انتہا پسند تحریکوں کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں۔ ساورکر اور گولوالکر جیسے نظریہ سازوں نے اپنی کتابوں 'ہندتوا' اور 'بنچ آف تھاٹ' میں ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کا انتہا پسندانہ نقشہ پیش کیا۔ ان کے مطابق قدیم زمانے سے ہندوستان ایک ہی تہذیب 'ہندو تہذیب' کا گہوارہ رہا ہے مگر مسلمان حکمرانوں اور عیسائی وکمیونسٹ تحریکوں کی مداخلت نے اس ایوان تہذیب کے نقش ونگار کو تہ وبالا کر دیا۔ ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ پھر اسی ہندو تہذیب کا احیاء کیا جائے۔ مسلمان، عیسائی اور کمیونسٹ اگر برضا ورغبت اس تہذیب میں اپنے آپ کو ضم کرلیں تو زہے نصیب، اگر وہ ہندو تہذیب کا حصہ نہیں بننا چاہتے تو ہندوستان میں بہر حال ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ یا تو از خود کسی اور ملک میں پناہ تلاش کریں یا پھر انہیں ہندو احیاء پرستوں کی جانب سے تشدد کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جونیئر ہندو انتہا پسند دانشوروں نے گوہار لگائی کہ مسلمانوں نے جب اپنے لئے پاکستان کی شکل میں ایک الگ ملک حاصل کرلیا ہے تو اب ہندوستان میں مسلمان بن کر رہنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس نظریہ کو ہندوستان میں عوامی مقبولیت حاصل ہو اس کے لئے کلیدی ہتھیار کے طور پر 'تاریخ' کا استعمال کیا گیا۔ ایسی تاریخیں لکھی گئیں جنہیں پڑھ کر نوجوان نسل کو یہ تاثر ملا کہ اس ملک کے لیے مسلمانوں کا کوئی کنٹری بیوشن نہ تقسیم سے پہلے رہا ہے اور نہ اس کے بعد۔ مسلمان جس قوم کا نام ہے وہ در حقیقت خوں خوار لٹیروں کا ایک گروہ ہے، جو ہندوستان پر حملہ آور ہوا، جس نے مندروں کو منہدم کیا، ہندوؤں کو بالجبر مسلمان بنایا، ہندو تہذیب کے دیگر شعائر کا قلعہ قمع کیا۔ یہی وہ گروہ ہے جو دو قومی نظریہ کا بانی اور تقسیم ہند کا تنہا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد اب یہ 'ناجائز' طور پر ہندوستان میں متوطن ہے۔ مسلم تاریخ کو مسخ کرنے کی یہ مہم تا حال جاری ہے۔ یہ کام مختلف محاذوں پر انجام دیا جا رہا ہے۔ کبھی مسلم تاریخی عمارتوں کی تاریخ میں ردوبدل کیا جا رہا ہے، مسلم نام والے شہروں کے نام من گھڑت قصے کہانیوں کی بنیاد پر تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اسکولوں کی نصابی کتب پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ مسخ کرنے والا دوسرا محاذ لیفٹ یعنی اشترا کی کوچہ گردوں کا ہے۔ ہم اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں کرتے کہ ہندو انتہا پسند مؤرخین کی تاریخی موشگافیوں کا اسلام پسندوں سے زیادہ شاندار اور انصاف پسندانہ جواب مارکس وادیوں نے ہی دیا ہے۔ بلکہ اُن کا اگر کسی نے صحیح معنوں میں مقابلہ کیا ہے تو اِن ہی نے کیا ہے۔ اس کے باوجود جب انہوں نے خود تاریخ پر قلم اٹھایا ہے تو اپنے آپ کو تعصب سے پاک نہیں رکھ سکے ہیں۔ دانشوری، روشن خیالی اور ترقی پسندی کے زعم میں یہ بے چارے سنگین مغالطوں کے شکار ہیں۔ ایک طرف انہوں نے مذہب کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے رکھا ہے۔ دوسری طرف معاش کے سوال کو زندگی کا سب بڑا سوال قرار دیتے ہیں۔ اس فکر کے ساتھ جب وہ تاریخ پر خامہ فرسائی کرتے ہیں تو اسباب وعلل کی ساری تان مذہب اور معاشی بدحالی پر توڑتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو معاشی طور پر انتہائی پسماندہ اور مذہبی طور پر انتہا پسند اور جنونی ثابت کرنے کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کرتے۔ ان کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کے ذمہ دار انگریز یا ملک کا حکمراں طبقہ نہیں بلکہ وہ خود ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک طرف مذہبی طور پر انتہا پسند ہیں، اور دوسری طرف معاشی لحاظ سے انتہائی بدحال۔ چنانچہ مذہب کو خیر آباد کہنا اور معاشی طور پر بااختیار ہونا ہی مسلمانوں کے تمام مسائل کا اصل ہے۔

بہر حال یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ گزرے ہوئے چند سالوں میں ملت کے تعلیم یافتہ حلقے میں اس سلسلے میں بھی بیداری آئی ہے۔ اسلامی طلبہ تحریک نے ملک کی مختلف ریاستوں میں اور قومی سطح پر اس حوالے سے متعدد سمینار اور کانفرنسیں منعقد کی ہیں۔ البتہ دلی ہنوز دور است! انگریز، ہندو انتہا پسند اور اشترا کی حضرات نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ جو چھیڑ چھاڑ کی ہے، جس کی مہم بدستور جاری ہے، اس کے سلسلے میں صرف تحریک اسلامی کو نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملت کے ذہین اور ہونہار طلبہ تاریخ کو اپنا میدان تخصص بنائیں اور تاریخ کو مسخ کرنے کی ہر نئی کوشش کے مقابلے میں مستقل چوکسی (eternal vigilance) کا کام انجام دیں۔ چند افراد کے کرنے سے اس کام کا حق ادا نہ ہوگا۔ اس کام کو منصوبہ بند طریقے سے ادارہ جاتی سطح پر انجام دینا ہوگا۔

سعود فیروز

دائیں بازو کی تاریخ نویسی سماجی تنوع کے لیے خطرہ

سید سعادت اللہ حسینی

یہ مقالہ ایک ایسے دور میں لکھا جارہا ہے جب کہ پوری دنیا اکثریتی انتہا پسند نسل پرست تحریکات کے دوبارہ ظہور کا مشاہدہ کررہی ہے۔تشدد،نسل پرستی اور اکثریت پرستی اس عہد کا ایک بڑا چیلنج بن چکی ہے۔اس پس منظر میں حاشیے پر رکھے گئے طبقات کی آوازوں کو سامنے لانا اور انہیں اصل دھارے کے علمی مباحث کا حصہ بنانا بے حد اہمیت کا حامل ہے۔چوں کہ تاریخ کا بڑے پیمانے پر غلط استعمال ماضی میں بھی کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کیا جارہا ہے،اور یہ نسل پرستی اور انتہا پسندی پر مبنی تحریک کا ایک طاقتور ہتھیار بن چکی ہے،تاریخ اور تاریخی معلومات کے مناسب اور غیر متعصب فہم کو نشو و نما دینا بہت ضروری ہے۔حاشیے پر رکھے گئے طبقات کی تاریخ کا مطالعہ انہیں با اختیار بنانے کا اہم وسیلہ ہے۔اس طرح کا مطالعہ متعلقہ طبقات کے مثبت کردار اور خدمات کو نمایاں کرتا ہے۔ساتھ ہی یہ ان طبقات کے خلاف موجود فرقہ وارانہ،ذات پات اور نسل سے متعلق تعصّبات کا بھی خاتمہ کرسکتا ہے۔

ہم تاریخ کیا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟ تاریخ موجودہ صورت حال کو سمجھنے،اور مستقبل کے تئیں مناسب لائحہ عمل اختیار کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔تاریخ ہمیں ماضی سے سبق سیکھنے اور موجودہ حالات کو سمجھنے کے قابل بناتی ہے۔تاریخ دنیا اور امور دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں پس منظر فراہم کرتی ہے۔ فقدان یادداشت (amnesia) ایک ذہنی بیماری ہے جو دماغ کے خلیوں کے نقصان کے سبب لاحق ہوتی ہے،اور مریض اپنی یادداشت کھودیتا ہے۔یہ انتہائی درد ناک اور اذیت ناک بیماری ہوتی ہے کیوں کہ یہ مریض سے اس کا ماضی چھین لیتی ہے۔مریض اپنی شناخت کھودیتا ہے۔وہ اپنے

تجربات بھول جاتا ہے۔ زندگی بھر کا حاصل کردہ علم اور مہارت سب ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ سے اس قسم کی لاتعلقی بذات خود ایک معذوری بن جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے تاریخ سے عدم واقفیت یا غلط واقفیت اجتماعی فقدان یادداشت (collective amnesia) کی ایک وسیع شکل ہے۔ تاریخ ہمیں اپنے ماضی سے، پوری انسانیت کے مشترکہ علم وحکمت اور تجربات سے جوڑتی ہے۔ لہذا اگر کوئی سماج تاریخ کو نظر انداز کردے یا تاریخ سے غلط واقفیت رکھے تو یہ پورے سماج کی اجتماعی معذوری کی علامت ہوگی۔

اسلام میں قرآن نے مطالعہ تاریخ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ نص قرآنی کا ایک معتدبہ حصہ تاریخی معلومات پر مشتمل ہے۔ ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے اور آدم، نوح، ابراہیم، موسی، عیسی اور یوسف علیہم السلام وغیرہ نبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن ماضی کے صالح انسانوں اور فاسد انسانوں، نیک کرداروں اور بدکرداروں کی مثالیں فراہم کرتا ہے۔ تاریخ کے بیان کے بعد قرآن تاریخی واقعات، عذاب، عمل اور رد عمل اور رویوں پر تبصرے کرتا ہے۔ ان سے سبق کشید کرتا ہے اور پھر اس کی روشنی میں قاری کو مناسب لائحہ عمل عطا کرتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے معروف اسکالر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کے مشمولات کی درجہ بندی کی ہے۔ اس میں ایک اہم قسم جسے وہ بیان کرتے ہیں اس کا نام ہے "ایَّامُ اللّٰہ"، یعنی اللہ کے دن جس سے ان کی مراد تاریخی واقعات اور تاریخی معلومات ہیں۔ جو کہ قرآن کی اچھی خاصی آیات پر محیط ہیں۔ استقرائی منطق کا اطلاق کرتے ہوئے قرآن تاریخی تذکروں سے تمام انسانوں کے لیے اور ہر زمانے کے لیے عالمگیر دروس واصول اخذ کرتا ہے۔ قوموں کا عروج وزوال انہیں اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے، جنہیں قرآن "سُنَّۃُ اللّٰہ"، یعنی قانون الٰہی کا نام دیتا ہے۔ "فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیلاً" (تم سنت الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ سنت الٰہی کو ٹلتے ہی پاؤ گے، سورہ فاطر، آیت 43)

الغرض، مطالعہ تاریخ کا مقصد ان آفاقی وعالمگیر اصولوں کو سمجھنا ہونا چاہیے۔ ابن خلدونؒ اور پروفیسر ٹوائن بی جیسے علمائے تاریخ نے تاریخ کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے انسانی تہذیب کے لئے عالمگیر اصول اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ نویسوں نے عام طور پر مادی پہلوؤں پر مبنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے معیشت، فوج، سیاسی قوت، آبادیات، جغرافیائی سیاسیات، جغرافیائی حکمت عملی وغیرہ کو تاریخی محرکات کے کلیدی عوامل کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن اخلاقی وتعبدی عوامل کو اہمیت دیتا ہے۔ "وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" (اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کے کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا، سورہ الاعراف، آیت 96)

اللہ تعالی، جو سب سے زیادہ علم وحکمت رکھتا ہے، نے انسانوں کو باخبر کرنے اور انہیں متنبہ کرنے کے لیے تاریخ کو ذریعہ بنایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی فطرت میں دوسروں کی مثالوں اور ان کے ماضی سے سبق سیکھنے کا رجحان موجود ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سے صحیح سبق حاصل کرنے کا یہ کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب کہ جو تاریخ ہم پڑھتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی، غیر تحریف شدہ اور کسی بھی قسم کے امتیاز وتعصب کی آلائش سے پاک وصاف ہو۔ بدقسمتی سے تاریخ سماجی علوم کے ان شعبوں میں سے ایک ہے جن میں علمی تفریق وامتیاز کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ تاریخی بیانیے ہر عہد میں مؤرخ کے سیاسی جھکاؤ، حکمران وقت اور سیاست وقت کے ذریعہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ اس قسم کی جعلی تاریخ اجتماعی فقدان یادداشت (collective amnesia) سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ افسانے اور فرضی قصے کہانیوں کو حقیقت کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ سچے واقعات کو یا تو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی یا ضرورت سے بھی کم۔ مؤرخین کے سیاسی افکار کی بنیاد پر حقائق کو دانستہ طور پر مخفی رکھا گیا یا انہیں مسخ کیا گیا۔ مبالغہ آرائی مؤرخین کا بہت معروف ہتھیار رہا ہے۔ اس قسم کے نام نہاد مؤرخ تلاش حق کی جستجو میں نہیں بلکہ ایک مشن پر کام کر رہے ہیں۔ ایک محقق یا سنجیدہ مؤرخ کا فرض سنجیدہ تحقیق اور سچ کی سراغ رسانی ہے۔ جب کوئی محقق یا مؤرخ ایک مشنری کارکن بن جاتا ہے تو وہ تاریخی مواد کے ذریعے اپنے معاصر سیاسی، قبائلی اور نسلی حتی کہ مذہبی ایجنڈے کی توجیہہ تلاش کرنے لگتا

ہے۔ وہ محض اپنے مفاد کے حوالے تلاش کرنے لگتا ہے۔ اورناموافق حوالوں اور ذرائع کونظرانداز کرنے لگتا ہے یاان کی سوئے تعبیر سے کام لیتا ہے۔ وہ صحت، صداقت، احتمال، منطقی استحکام، معنویت، تکمیل اور انصاف جیسے علمی تقاضوں اور علمی اصولوں سے انحراف کرنے لگتا ہے۔

اِس عہد میں جب کہ تاریخ قومیت بلکہ قوم پرستی کا ایک اہم ذریعہ بن چکی ہے، تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کا مقابلہ ایک بڑا علمی چیلنج بن چکا ہے۔ لوگوں نے فرقہ-مرکوز (ethno-centric) تاریخ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ نازی مؤرخین کے ذریعے لکھی گئی تاریخ اس قسم کی کوششوں کی ایک بہترین مثال ہے۔ جوزیہ پرسٹ اور انیسویں صدی کے دیگر امریکی مصنفین نے جعلی تاریخی بیانیے رقم کیے۔ جنہوں نے افریقی امریکی اور مقامی امریکی باشندوں کو انتہائی منفی طور پر پیش کیا۔ اس قسم کی تاریخ نویسی یقیناً بے حد مضر ہے۔ گروہی اور فرقہ وارانہ دشمنی، تصادم اور تعصّبات بنیادی طور پر اسی قسم کی تاریخی تحریفات سے پیدا شدہ ہیں۔ لہذا مؤرخین کا کردار انتہائی ذمہ دارانہ کردار ہے۔

اسلام کے ایک طالب علم کے طور پر میں دوبارہ اسلامی تاریخ نویسی کی روایات کا حوالہ دوں گا۔ اسلامی تاریخ نویسی کے خدوخال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال فرمانے کے فوراً بعد ہی ظہور پذیر ہو گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے واقعات اور ان کی احادیث مبارکہ اسلامی تعلیمات کا ایک اہم ذریعہ تھیں، لہذا انہیں غایت درجہ احتیاط سے محفوظ کرنا ضروری تھا۔ ان کی سند مختلف ذرائع سے آ رہی تھیں، لہذا ذرائع کے قابل اعتماد ہونے کی توثیق کرنا بھی ضروری تھا۔ اس احتیاط کے نتیجے علم الاسناد، علم الأسماء الرجال، علم درایت جیسے عظیم الشان علوم کو فروغ ملا۔ ان اصولوں کا اطلاق بعد میں مسلم دنیا کی دیگر تاریخی شخصیات پر بھی کیا گیا۔ علم الاسناد اور اسماء الرجال کے یہ اصول کسی بھی روایت کو قبول یا رد کرنے کے لئے ایک سائنسی، جدید ترین اور قابل اعتماد نظام تحقیق پیش کرتے ہیں۔ ان اصولوں کے ذریعہ راوی کے ممکنہ تعصّبات کو کم کیا گیا اور تمام بے بنیاد قصے، کہانیوں، توڑ مروڑ اور مبالغہ آرائیوں کو الگ کر دیا گیا۔ یہ مؤرخین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دعوؤں کے تئیں ذمہ دار ہوں اور تاریخی مواد کی چھان بین اور تحقیق کے لیے اس قسم کے قابل اعتماد اور جدید ترین ذرائع کو فروغ دیں۔

اگر ہندوستان کی صورت حال کی بات کریں تو ہندوستانی تاریخ نویسی کے موجودہ مکاتب فکر برطانوی سامراجی طاقتوں کے منہج کے خوشہ چیں ہیں۔ برطانیہ ہندوستان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اپنی نو آبادیات اور نو آبادیاتی موضوعات کو سمجھنا ان کی ضرورت تھی۔ یہ وہ عہد تھا جب کہ یورپی نشاۃ ثانیہ اپنے عروج پر تھی اور تمام علمی روایات بنیادی طور پر یورپ-مرکوز (euro-centirc) تھیں۔ یورپ مرکوز حوالہ نے استشراقی

تصور کو جنم دیا۔ اور انہوں نے استشراقی سماج جیسی لغو چیز کو فروغ عطا کیا۔ ہندوستان کی تاریخیں بھی غیریت (otherness) کے اسی استشراقی احساس کے ساتھ لکھی گئی تھیں۔ سامراجی طاقتوں نے تاریخ کو اپنے تسلط کو مضبوط کرنے اور اپنے کردار کو قانونی واخلاقی جواز فراہم کرنے کے ذریعہ کے طور پر بھی استعمال کیا۔ برطانوی تسلط کو جائز ٹھہرانے کے لیے ہندوستانی سماج کو غیر عقلی، پسماندہ اور بے شمار داخلی تضادات اور مسائل رکھنے والا دکھانا ضروری تھا۔ انہوں نے تاریخ ہند کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔ قدیم ہندو دور، قرون وسطی کا مسلم دور اور جدید برطانوی دور۔ برطانوی سامراجی مؤرخین نے ہندوستان کے ابتدائی عہد کو بدترین اور بربری دور ثابت کر کے برطانوی تسلط کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کی۔ بعض دیگر برطانوی سامراجی مؤرخین نے ہندوستان کے عظیم ماضی، جسے 'مسلم حملہ آوروں کے ذریعے برباد کر دیا گیا' کی رومانوی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ جب ہندوستانی عوام نے مزید شہری آزادیاں عطا کرنے کا مطالبہ کیا تو برطانوی سامراجی انتظامیہ نے اس کا جواب ایسی تاریخیں لکھ کر دینا شروع کیا جس نے بتایا کہ مسلم دور حکمرانی کتنا وحشی اور خون کا پیاسہ تھا۔ اس کا مقصد برطانوی حکومت کو زیادہ قابل قبول اور جائز بتانا تھا۔ انہوں نے ان بیانیوں کا انتخاب کیا جو ایک مسلم حکمرانوں کی ایک وحشی اور مردُم کُش تصویر پیدا کر سکتے ہیں۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں اپنے قبضہ کو برقرار رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلم طبقات میں دشمنی پیدا کر دی جائے۔ لہذا انہوں نے ہندو اور مسلم کو ایک دوسرے کا حریف اور مخاصم

ان تمام غلط بیانیوں کو چیلنج کرنا اس وقت مؤرخین کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ دنیا بھر میں کسی سیاسی اور سماجی تعصب کے بغیر تاریخ کے مطالعے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ تاریخ نگاری نے ہمیشہ اپنی توجہ ریاست، حکمراں، اشرافیہ اور مڈل کلاس پر مرکوز کی ہے۔ تاریخ میں جب تک عوام اور ان کی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا، تاریخ کا ہمارا فہم نامکمل رہے گا۔ ماضی کا ہمارا فہم ہماری موجودہ سیاست پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں ایسے پیشہ ور تاریخ نویسوں کی ضرورت ہے جو علمی اصول وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے دیانت داری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کریں

دکھانا شروع کردیا۔ قرون وسطی کی پوری تاریخ کو ہندو مسلم تصادم اور جنگوں سے عبارت کردیا گیا۔

سامراجی تاریخ نویسی کے چیلنج کے بعد ہمارے سامنے ایک اور چیلنج ہے۔ جسے ہم غیر معمولی طور پر تعصب سے بھرپور، سیاسی طور پر تحریک حاصل کردہ تاریخ نویسی' کا چیلنج کہہ سکتے ہیں۔ یہ دائیں محاذ (Right Wing) کی تاریخ نویسی ہے، جو محب قوم ہونے کی دعوی دار بھی ہے۔ یہ مکتبہ فکر برطانوی طرز تاریخ نویسی سے بری طرح مرعوب ومتاثر ہے۔ اس فکر کے مؤرخین برطانوی مؤرخین کے ذریعے پیش کردہ تاریخی مواد سے بڑی حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے دور میں مذہبی بنیاد پر سماج کی تقسیم اور دوقومی نظریہ کے فروغ کا ذمہ دار بھی یہی مکتبہ فکر تھا۔ ایک جانب کی فرقہ پرستی نے دوسری جانب کی فرقہ پرستی کو طاقت بہم پہنچائی۔ بالآخر یہ کوششیں تقسیم ہند پر منتج ہوئیں۔

دائیں بازو کی تاریخ نویسی بنیادی طور پر ہندو مسلم تفریق (Binary) کے اردگرد گردش کرتی ہے۔ یہ قدیم ہندوستان میں (قدیم ہندو ہندوستان) کسی بھی برائی اور قرون وسطی کے ہندوستان میں (قرون وسطی کا مسلم ہندوستان) کسی بھی اچھائی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ذات پات کی بنیاد پر امتیاز اور تفریق وغیرہ جیسے ہندوستانی معاشرے کے بدترین مسائل کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ حتی کہ ان کی جڑیں بھی مسلم حکمرانی کے دور میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ 'ہزار سال کی غلامی' ایک عام محاورہ بن گیا ہے، جس میں برطانوی استعمار اور مسلم عہد حکمرانی کو ایک ہی سکے کے دو رخ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ بات صحیح ہوسکتی ہے قرون وسطی کی تمام سلطنتیں ظالم اور استحصالی تھیں۔ اور ان کا بنیادی مقصد اپنی سلطنت اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا تھا۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ برطانیہ کی طرح سامراجی طاقتیں تھیں۔ قرون وسطی کے مسلم حکمرانوں میں سے کسی نے بھی استعماری طاقت کے طور پر کام نہیں کیا۔ انہوں نے مقامی وسائل کو غیر ملکی زمین پر منتقل نہیں کیا، بلکہ ان کا تو اپنے اصل ممالک کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد، وہ ہندوستانی معاشرے کا ایک مستقل رکن بن گئے۔ انہوں نے صرف اپنے ہم مذہب اور اپنے ہم قبیلہ افراد کو فائدہ نہیں پہنچایا۔ ہندوستان کے قرون وسطی کا دور اشرافیہ سے عبارت ہے۔ جو ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ چنانچہ ان کے استحصال کا شکار طبقے بھی ہندو اور مسلم دونوں تھے۔ اس نظام کا موازنہ جدید برطانوی سامراج کے ساتھ کرنا مکمل طور پر گمراہ کن ہے۔

دائیں بازو کی تاریخ نویسی فرقہ وارانہ تصادم پر منحصر ہے۔ یہ بیانیے نہ صرف علمی اہمیت کے حامل ہیں، بلکہ یہ غیر معمولی سماجی اور سیاسی اثر رکھتے ہیں۔ اعلی سطحی دانشوروں اور میڈیا کے حلقوں سے، بہت سنجیدہ اور منجھے ہوئے انداز میں بیان کیے گئے یہ بیانیے، جنہیں تنقید نگاروں نے بجا طور پر 'واٹس ایپ اسکول آف رائٹ ونگ ہسٹوریوگرافی' کا نام دیا ہے، نام نہاد مسلم درندگی سے متعلق مکمل طور پر افسانوی، مگر بے حد اشتعال انگیز اور زہر آلود، تاریخی مواد پیش کرتے ہیں۔

برطانوی اور دائیں بازو کی تاریخ نویسی کے یہ دونوں مکاتب فکر، ایک نقطہ اشتراک بھی رکھتے ہیں۔ دونوں کی زندگی قرون وسطی کے مسلم عہد حکمرانی کو بدنام کرنے سے وابستہ ہے۔ دونوں کا مقصد موجودہ ہندوستان کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کرنا ہے۔ دونوں ہندوستان کے کثیر ثقافتی اور جمہوری تانے بانے کے لئے سنگین خطرہ ہیں۔

ان تمام غلط بیانیوں کو چیلنج کرنا اس وقت مؤرخین کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ دنیا بھر میں کسی سیاسی اور سماجی تعصب کے بغیر تاریخ کے مطالعے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ تاریخ نگاری نے ہمیشہ اپنی توجہ ریاست، حکمراں، اشرافیہ اور مڈل کلاس پر مرکوز کی ہے۔ تاریخ میں جب تک عوام اور ان کی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا، تاریخ کا ہمارا فہم نامکمل رہے گا۔ ماضی کا ہمارا فہم ہماری موجودہ سیاست پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں ایسے پیشہ ور تاریخ نویسوں کی ضرورت ہے جو علمی اصول وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے دیانت داری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کریں۔ ایک افریقی ضرب المثل کے مطابق "جب تک جنگل کے شیر کے پاس اپنا خود کا تاریخ نویس نہیں ہوگا، تاریخ ہمیشہ شکاری کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے گی۔" لہذا ضرورت ہے کہ شیروں کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

SYED SADATULLAU HUSSAINI
Ameer, Jamat-e-Islami Hind
New Delhi.

مؤرخین کے ترکش کے تیر

(تاریخ ہند کے تناظر میں)

خان یاسر

جب میں کسی دس سالہ بچے کو یونیفارم پہنے ہوئے، پیٹھ پر انتہائی وزنی بستہ لٹکائے اسکول کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہوں تو اس کے متعلق میں ایک بات یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور تاریخ پڑھتا ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہر طالب علم اسکول میں تاریخ پڑھتا ہے، یہ عہد نامعلوم سے بے احد اہم مضمون رہا ہے۔ البتہ میرا دعوی ہے، اور یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے، کہ اس طرح کی اکثر پڑھائی محض اسماء وتواریخ کو نگل کر امتحان میں ان کی قئے کر دینے پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ دس سال کے عرصہ پر محیط اس موضوع کو پڑھنے کے باوجود طلبہ 'تاریخ کسے کہتے ہیں؟' جیسے بسیط سوال کا جواب دینے کے بھی لائق نہیں ہوتے۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ تاریخ کیسے لکھی جاتی ہے یا ایک مخصوص واقعہ کی کیا مختلف تاریخی تعبیرات ہیں، تو آپ یا تو ان کا چہرہ فق پائیں گے یا وہ تحقیر آمیز انداز میں اپنا منہ بناتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ جاننے کی زحمت تو یقینا کوئی نہیں کرتا کہ فلسفۂ تاریخ عین تاریخ نویسی کے عمل پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟ حتی کہ ریسرچ کی سطح پر بھی ایک بے چارہ اوسط ذہن رکھنے والا طالب علم فلسفہ تاریخ سے متعلق شاید ایک دو بات تو جانتا ہو، تاہم اسے کبھی ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ ان باتوں کی تنقیدی سمجھ پیدا کرے۔

بالکل ابتداء سے ہی تاریخ سے میری دلچسپی اس کے تنقیدی مطالعہ سے رہی ہے۔ چنانچہ نصابی کتب کا مطالعہ کرنے کے دوران اور محاظرات سننے کے وقت اِس قسم کے سوالات کہ ''کیا یہ واقعہ واقعی رونما ہوا تھا؟''، ''کیا یہ سب ہوا تھا؟''، ''کیا کوئی حقیقت غائب ہوگئی ہے؟''، ''کیا اس میں کچھ غلط ہے؟'' وغیرہ میرے مستقل ساتھی رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، تاریخ کی پہلی 'رسمی' کتاب جس سے میں متعارف ہوا وہ تیسری جماعت میں میری نصابی کتاب تھی۔ کتاب کے پہلے سبق نے مجھے بتایا کہ کیسے انسانوں کا ارتقاء عظیم اتفاقی

ماضی میں جو کچھ واقع ہوا ہے اسے محض پیش کر دینا اس قدر اتفاق اور شماریات پر مبنی طریقہ ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں بنتی۔ لہذا تاریخ کا شعبہ ماضی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے، (سالوں، شاہی خاندانوں اور ترقیاتی کام وغیرہ پر مبنی) اس کی مختلف ادوار میں درجہ بندی کرتا ہے۔ مؤرخ کا تعلق 'حال' سے ہوتا ہے، لہذا وہ معاصر عقل وفہم کی روشنی میں تاریخ کو بیان کرتا ہے، کیوں کہ وہ تاریخ کو دراصل 'حال' ہی کہ پیرائے میں سمجھتا ہے۔

حادثات کے ذریعے ہوا ہے۔ کم سنی کے باوجود اسلامی کہانیوں اور سوانح کا حریص قاری ہونے کی وجہ سے مجھے تعجب ہوا، ''یہ سچ نہیں ہوسکتا!''۔ یہ آغاز تھا، مستقبل میں ایک طویل سفر کا۔ جیسے جیسے میں اگلی جماعتوں میں بڑھتا گیا، تاریخ کی نصابی کتب پر میرا شک وشبہ بڑھتا گیا۔ اس وجہ سے میرے ہم جماعت ساتھیوں، اور بطور خاص اساتذہ سے بھی، کئی 'تاریخی' جنگیں بھی لڑنی پڑیں۔

ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے میں اس بات کا بالکل قائل ہو چکا تھا (اور ان سالوں میں کئی دوستوں اور اساتذہ کو بھی قائل کر چکا تھا) کہ تاریخ کی ہماری نصابی کتب متعصب ہیں۔ ان میں چند چیزوں کی وہ پردہ پوشی کرتے یا نظر انداز کرتے ہیں، جب کہ چند دوسری چیزوں کے سلسلے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ کام وہ ایک 'مقصد' کے تحت کرتے ہیں۔ نصابی کتابوں میں 'سچ' کو بے نقاب کرنے کی جستجو جس کی ابتداء نصابی کتب کی صداقت پر شک وشبہ سے ہوئی تھی بالآخر اس موضوع پر تنقیدی-تحقیقی اضافات کی ایک مستقل خواہش پر منتج ہوئی۔ جلد ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ 'تاریخ' اور 'ماضی' کے مابین ایک مہین فرق ہے اور تاریخ 'حال' اور 'مستقبل' سے بھی اسی قدر متعلق ہے جس قدر کہ 'ماضی' سے۔ رومیلا تھاپر کے الفاظ میں یہ ایک ''دوطرفہ عمل'' ہے، ''جس میں حال کی ضروریات کا مطالعہ ماضی میں کیا جاتا ہے، اور جہاں ماضی کی تصویر کی حال پر اطلاق کی کوشش کی جاتی ہے۔'' مختصر یہ کہ ''ماضی کی تصویر مستقبل کے لئے مؤرخ کا تحفہ ہے۔''

ماضی میں جو کچھ واقع ہوا ہے اسے محض پیش کر دینا اس قدر اتفاق اور شماریات پر مبنی طریقہ ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں بنتی۔ لہذا تاریخ کا شعبہ ماضی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے، (سالوں، شاہی خاندانوں اور ترقیاتی کام وغیرہ پر مبنی) اس کی مختلف ادوار میں درجہ بندی کرتا ہے۔ مؤرخ کا تعلق 'حال' سے ہوتا ہے، لہذا وہ معاصر عقل وفہم کی روشنی میں تاریخ کو بیان کرتا ہے، کیوں کہ وہ تاریخ کو دراصل 'حال' ہی کہ پیرائے میں سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر قدیم ہندوستان کے دیہاتوں میں جو نظام جاری تھا (حتی کہ یونان کی شہری-ریاستوں میں بھی) اسے 'جمہوریت' قرار دینا، حال کی آنکھوں سے ماضی کو دیکھنے کا عمل ہے۔ یہ بہت ہی معمولی مثال ہے ورنہ بات اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے جب تاریخ کسی فاتح کی جانب سے لکھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہٹلر اور مسولینی دوسری عالمی جنگ جیت گئے ہوتے تو آج ہم جس تاریخ عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اس میں ان دونوں کی اتنی منفی تصویر سامنے نہ آتی۔ مزید یہ کہ، مجھے احساس ہوا کہ تاریخ عہد رفتہ کے لوگوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تفصیلی بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو کسی مخصوص عمل کی تقلید کرنے یا اس سے اجتناب کرنے کے ایک سبق کے طور سمجھا جاتا ہے۔ نیز، تاریخ اکثر کسی نہ کسی عہد کو 'عہد زریں' کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ اس مقصد کہ پیش نظر کہ مستقبل کی تشکیل بھی عظمت رفتہ کے حصول کے ذریعے ہی ہو۔ اس طرح تاریخی مباحث، ان کی جڑیں ماضی میں گہری پیوستہ ہونے کے باجود ہمیشہ روبہ مستقبل ہوتے ہیں۔

ایک اور ادراک جو ہوا وہ یہ تھا کہ مؤرخین کے ترکش میں ایسے کئی تیر اور ہتھیار ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ سیموئل بٹلر بالکل جارحانہ انداز میں دعوی کرتے ہیں کہ ''خدا بھی تاریخ میں تحریف نہیں کر سکتا، لیکن مؤرخین کر سکتے ہیں۔'' تاریخ میں یہ 'تحریف' مختلف مقاصد کے پیش نظر کی گئی ہے جن کا تعلق نظریاتی وابستگی سے لے کر سماجی پس منظر تک سے ہے۔ میں اسے ہندوستان اور اس کی تحریک آزادی کی مثال سے واضح کروں گا تا کہ باتیں زیادہ پیچیدہ نہ ہوں اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہوں۔

1

تاریخ کو ادوار پر مبنی درجہ بندی کے ذریعے سمجھنا پہلی نظر میں بہت معقول معلوم ہوتا ہے، تاہم تاریخ کا یہ عہد کرن (periodisation) مؤرخین کے ہاتھ میں ایک کارگر ہتھیار ہے۔ جیمس مِل نے اپنی کتاب The History of British India میں تاریخ ہند کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے؛ ہندو عہد، مسلم عہد اور برطانوی عہد۔ اگر ہم علمی کھوج کرید کو درکنار کر دیں، تو سادہ لفظوں میں، انہوں نے مسلم حکمرانوں کی آمد سے پہلے پورے دور کو 'ہندو عہد' کے نام سے موسوم کر دیا۔ یہ عہد مقامی باشندوں کے لیے نسبتاً ایک بہتر اور رحمت کا عہد تھا، اس کے باوجود کہ یہاں بین ریاستی جنگیں اور ذات پات کی بنیاد پر امتیاز اور تعصب موجود تھا۔ اس کے بعد مسلمان آ گئے اور انہوں نے بقول جیمس مِل، ملک کو فتح کر کے، اس پر قبضہ کر کے، اسے تباہ کر دیا۔ یہ دور تاریخ ہند کا تاریک ترین دور تھا جو مذہبی عدم رواداری، جزیہ، بالجبر تبدیلی مذہب اور مقامی باشندوں کی عصمت ریزی اور قتل عام سے بھرپور تھا۔ انگریز، جنہیں

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جیمس مِل کے ذریعے تاریخ ہند کو تین ادوار، ہندو دور، مسلم دور اور برطانوی دور (نوٹ کریں 'برطانوی دور' عیسائی دور نہیں) میں تقسیم کرنے کا مقصد ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی ضرورت بلکہ ناگزیریت کو علمی سطح پر جواز فراہم کرنا تھا۔ اس تھیوری نے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کو بھی جواز فراہم کیا اور اسے علمی توثیق عطا کی۔

ہندوستانیوں کے مسیحا کے طور پر پیش کیا گیا، کی آمد سے تاریخ ہند کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انہوں نے مسلم حکمرانوں کو شکست دے کر مقامی لوگوں کو ان کے تسلط سے آزادی دلائی۔ وہ ہندوستان میں ثقافت، سائنس اور تعلیم لے کر آئے۔ اسی طرح انہوں نے آزادی، مساوات، حقوق انسانی، انصاف اور جمہوریت وغیرہ تصورات کو فروغ دیا۔ جیمس مِل نے اس حد تک دعویٰ کیا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان پر حکومت صرف اس وجہ سے کی کہ یہاں کے مقامی باشندے خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے قابل نہ تھے۔ انہوں نے حکومت کی تا کہ مقامی لوگوں کو اس حد تک باشعور اور مہذب بنا دیں کہ اپنے اجتماعی معاملات وہ خود ہی چلا سکیں۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جیمس مِل کے ذریعے تاریخ ہند کو تین ادوار، ہندو دور، مسلم دور اور برطانوی دور (نوٹ کریں 'برطانوی دور' عیسائی دور نہیں) میں تقسیم کرنے کا مقصد ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی ضرورت بلکہ ناگزیریت کو علمی سطح پر جواز فراہم کرنا تھا۔ اس تھیوری نے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کو بھی جواز فراہم کیا اور اسے علمی توثیق عطا کی۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ جیمس مِل کی بدنام زمانہ درجہ بندی کو ہماری تاریخ کی نئی درجہ بندیوں میں بھی شامل کیا جاتا ہے جسے ہم نصاب میں پڑھتے ہیں۔

عہد قدیم کا ہندوستان، عہد وسطیٰ کا ہندوستان اور جدید ہندوستان کی درجہ بندی بھی بادی النظر میں محض ایک علمی ضرورت معلوم ہوتی ہے، لیکن ایسا ہے نہیں۔ یہ درحقیقت برطانوی دور حکومت سے ہی ایک سیاسی ضرورت ہے۔ ایک اور رجحان تاریخ کو ماقبل جدید اور جدید مرحلوں میں منقسم کرنے کا ہے، کچھ لوگ اسے ماقبل نوآبادیاتی، نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی درجہ بندیوں میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ نوآبادکاری یا سامراجیت جیسی انتہائی منفی چیز کو بھی غیر ضروری اہمیت دیتی ہیں اور انہیں ایک سنگ میل خیال کرتی ہیں، حالانکہ وہ سنگ میل بالکل نہیں ہے۔ عین اسی قسم کی درجہ بندی کا عکس ہندوتوا فرقہ پرست طاقتوں کی بیان کردہ تاریخ میں بھی نظر آتا ہے: 1) ہندو عہد زریں، 2) مسلمانوں کے ظلم و ستم کا دور، 3) انگریزوں کے ظلم و ستم کا دور، 4) نام نہاد سیکولرازم کا دور۔

2

مؤرخ کے ہاتھ میں دوسرا ہتھیار زمرہ بندی یا گروہ بندی (categorisation) کا ہے۔ ہیرو اور ویلن، دوست اور دشمن، ہم کو اور ان کو، یہ چند گروہ بندیاں ہیں جن میں مؤرخین تاریخی شخصیات کو فٹ کرتے ہیں پھر ان کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں۔ یہ کیسے کیا جاتا ہے؟ مثال کے طور پر کسی شخص کو فسطائی یا دہشت گرد قرار دیا گیا (ویلن)، جب کہ دوسرے کو لبرل ازم، سیکولرازم اور جمہوریت کا دفاع کرنے والا (ہیرو)۔ تحریک آزادی ہند میں بھی مختلف شخصیات کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اسی تقسیم کی بنیاد پر ذہن عام اور کتب نصاب میں ان کا کردار طے کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل تحسین زمرہ 'سیکولر قوم پرستوں' کا ہے جس کی نمائندگی موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لعل نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ کرتے ہیں۔ اس زمرہ سے کم تر لیکن ہنوز مثبت 'ترقی پسند سوشلسٹوں' کا زمرہ ہے جس کی نمائندگی سبھاش چندر بوس، جے پرکاش نرائن اور رام منوہر لوہیا وغیرہ کرتے ہیں۔ منفی زمرہ ان لوگوں کا ہے جو فرقہ پرست ہیں، جن نمائندگی خاص طور پر محمد علی جناح اور ان کو ماننے والے کرتے ہیں۔ اس آخری زمرے میں اگرچہ کہ ہندو انتہا پسند لیڈروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جیسے ہندو مہاسبھا کے قائدین، لیکن مسلم فرقہ پرست کو ان سے زیادہ لائق ملامت تسلیم کیا جاتا ہے کیوں کہ، جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے، وہی تقسیم وطن کا اصل ذمہ دار ہے۔ اس قسم کی زمرہ بندی کے اثرات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں ایک دوست کو اقبال اور ان کی نظمیں صرف سننے کے لیے کہہ رہا تھا؛ "کیا تم اُس کمیونل شاعر- سیاست داں کی بات کر رہے ہو جس نے نظریہ پاکستان پیش کیا؟"۔ یہاں دراصل ہوا یہ ہے کہ ایک محب وطن شاعر کی خدمات کو تاریخ کے کوڑے دان کی نذر کر دیا گیا کیوں کہ مؤرخین کے ایک گروہ نے اس کا ذکر 'فرقہ پرست' کے زمرے میں کیا تھا۔ ٹھیک وہی مؤرخین جواہر لعل نہرو کا ذکر سیکولر قوم پرست کے زمرے میں کرتے ہیں اور اس طرح ان کی سنگین غلطیوں سے ان کو بری الذمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کا وہ خطرناک پریس بیان جس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے کیبنٹ مشن پلان کے فہم کو سبوتاژ کر دیا اور یہی تقسیم ہند کا اصل سبب بنا۔

3

ایک مؤرخ کے ترکش میں سب سے اہم ہتھیار یقیناً 'تعبیر' کا ہوتا ہے۔ چنانچہ 1857 کی شورش- 1) فوجی بغاوت تھی، 2) پہلی جنگ آزادی، یا

3) ایک مسلم بغاوت تھی۔ یہ الگ الگ مؤرخین کی مختلف 'تعبیروں' پر منحصر ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے تحریک خلافت کو جو تعاون فراہم کیا اس کو ان عوامل کے چور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ 1) اس نے ہندو۔مسلم اتحاد کو مضبوط کیا، 2) مسلم فرقہ پرستی کو تقویت پہنچائی، یا 3) یہ تعاون خود انڈین نیشنل کانگریس کو ملک گیر کرنے کے لیے ضروری تھا۔ یہی بات اس معاملے میں بھی صحیح ہے کہ تقسیم ہند کا سب سے بڑا ذمہ دار کون ہے: کیا یہ جناح، نہرو، پٹیل یا ماؤنٹ بیٹن تھے؟ یا کوئی اوران سب کا انحصار متعلقہ تعبیروں پر ہے۔

زمانے کے ہیروز جیسے فیروز شاہ مہتا، گوپال کرشن گوکھلے، محمد علی جوہر، محمد علی جناح اور ابوالکلام آزاد وغیرہ نے عملاً جتنے بڑے کارنامے انجام دیے، کتابوں میں ان کے حسب شان اعتراف نہیں کیا گیا (صرف تِلک اور نوروجی اس سلسلے میں مستثنیٰ ہیں)۔ تقسیم وطن کی جو کہانی ہم پڑھتے ہیں اس کے متعدد پہلو غائب ہیں۔ کس طرح ہندو قوم پرستوں نے 1886ء ہی میں دوقومی نظریہ گھڑا، کیسے جناح کو تقسیم قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، کیسے نہرو اور پٹیل ایک متحدہ قوم کے لیے ایک مضبوط مرکز کو ترجیح دی، ہماری کتابوں سے مکمل طور سے غائب ہے۔

4

ایک معروف ہتھیار جس کا استعمال مؤرخین کرتے ہیں، وہ حذف کرنے کا منہج (Method of Omission) ہے۔ مؤرخین تاریخ کے بہت سے 'ناپسندیدہ' پہلوؤں کو اپنے بیان سے حذف کر دیتے ہیں۔ محذوف کرنے کے اس عمل کے ذریعے تاریخ کی تصویر بدل دی جاتی ہے (اکثر اپنے موافق بنالی جاتی ہے) اور انہیں ان افکار و نظریات سے ہم آہنگ بنا دیا جاتا ہے جن کو زمانہ حال میں فروغ دینا مؤرخ کے پیش نظر ہوتا ہے۔ دوبارہ تحریک آزادی ہند کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ کئی مؤرخین اور تاریخ کی نصابی کتابیں 1857 سے پہلے برطانوی استعمار کے خلاف لڑی گئی جنگوں کو بڑی آسانی سے حذف کر دیتی ہیں۔ برطانوی استعمار کے خلاف 1887 سے پہلے لڑی گئیں مختلف جنگوں اور دفاعی کوششوں کی زیادہ سے زیادہ ایک یا دو پیراگراف میں تلخیص پیش کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ برطانیہ کے خلاف تحریک کا صحیح معنوں میں 'آغاز' 1857 کی 'پہلی' جنگ آزادی سے ہوا۔ اس طرح کے بے شمار محذوفات 1857 کے بعد کی تاریخ میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا محمود حسن اور ان کے شاگردوں کی قیادت میں چلائی گئی 'ریشمی رومال تحریک' کا آپ کو کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملے گا۔ ہم تحریک آزادی کے جس بیانیے کو پڑھتے ہیں اس میں علماء، مدارس، اردو اخبارات اور اردو زبان و ادب وغیرہ کا کردار، سب غائب ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں تحریک خلافت کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن اس کی اصل اہمیت کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ تحریک آزادی ایک متنوع جدوجہد تھی جس میں مختلف افراد اور گروہ اپنے اپنے طور سے بیک وقت شامل تھے۔ لیکن تاریخ کی ہماری نصابی کتب کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے گویا تحریک آزادی ہندوستان کی نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک تھی۔ علاوہ ازایں، بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ان کے شایان شان تھی۔ گاندھی اور نہرو کی شخصیتوں کی پیشکش کچھ اس انداز میں کی گئی ہے گویا بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے یہی دو شخصیتیں سب زیادہ اہمیت رکھتی تھیں، جو کہ بالکل غلط بات ہے۔ اپنے اپنے

5

آخری، تاریخ کا سب سے معروف عنصر اس میں 'جھوٹ کی آمیزش' ہے۔ بلاشبہ، یہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تاریخی بیانیہ حال کے مقاصد کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، یہ بات کہ مسلم حکمرانی کے پورے دور میں ہندو اور مسلم 800 سال تک اقتدار کے حصول کے لیے پُرتشدد رسہ کشی کرتے رہے، یہ ایک افسانہ ہے جسے ہندتوا طاقتیں غلط طریقے سے ایک تاریخی حقیقت کے طور پر فروغ دیتی رہی ہیں۔ مہاراشٹر میں شیوا، جسے عرف عام میں شیوا 'جی' کہا جاتا ہے (یہ بھی ایک تاریخی چال ہے) کی تقریباً عبادت کی جاتی ہے کیوں کہ وہ 'مرہٹوں کا مسیحا' تھا اور اس نے اورنگ زیب کو 'شکست' دی تھی۔ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ اسی واقعہ کو دیکھ لیجئے کہ کیسے شیوا نے بغل گیر ہوتے وقت افضل خان کا دھوکہ سے قتل کر دیا جب کہ خوب شیوا نے ہی افضل خان کو صلح کے لیے ملاقات کی دعوت دی تھی۔ کیا بہادری ہے، سچ میں! اب یہ حقیقت بھی کہ افضل خان آہنی زرہ پہن کر نہیں آیا تھا، مؤرخین کو اس افسانہ پردازی سے باز نہیں رکھتی کہ دراصل خود افضل خان ہی شیوا کے قتل کے ارادے سے آیا تھا اور کچھ نے تو اس حد تک بھی دعویٰ کیا ہے کہ پہلا وار افضل خان ہی نے کیا تھا۔ اسی طرز پر ہم پڑھتے ہیں کہ اورنگ زیب مذہبی انتہا پسند تھا جو مندروں کو توڑتا پھرتا تھا، ہندوؤں کو بالجبر مسلمان بناتا تھا؛ دوقومی نظریہ مسلم لیگ نے متعارف کرایا؛ مسلمانوں کی شکایتیں جھوٹی تھیں، تشکیل پاکستان کا آوازہ محمد اقبال نے بلند کیا، وغیرہ۔

یہ تمام باتیں دراصل مؤرخین کی افسانہ نگاری کی صلاحیت کی مثالیں ہیں. (انگریزی سے ترجمہ، تفصیلی مطالعہ کے لیے کتاب ملاحظہ فرمائیں: A Philosophical Discourse on the:History: (Concept of Past and Future

KHAN YASIR
Faculty, Indian Institute of Islamic Studies,
New Delhi Email:yasiratiq@gmail.com

نظر
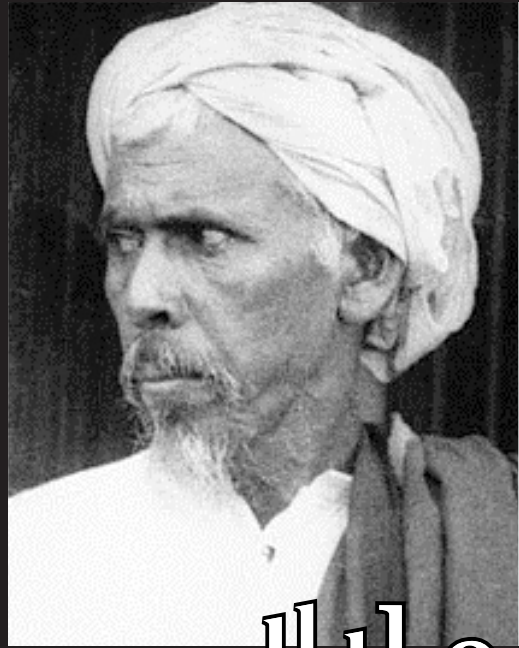
مایلا بغاوت کی غلط تعبیرات

محمد شاہ ایس

یہ عنوان تھوڑا سا پیچیدہ ہے۔لیکن اس کے باوجود میں نے اسے ایک مخصوص تصور تاریخ کی بالادستی کو ختم کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔اُن طبقات کے افراد میں، جنہیں روزمرہ کے محاورے میں 'مظلوم طبقات' سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاریخ میں ان کے مقام اور شناخت کے حوالے سے ایک اضطراب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔یہ کیفیت تاریخ کے موجود نہ ہونے کے احساس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔یہی احساس جس کی موجودگی کا ہم پر اکثر الزام لگتا ہے، مذکورہ بالا اضطراب کا سبب ہے۔یہ اضطراب تاریخ کے ہمارے تصور جس میں ہم تاریخ کو علوم انسانی کا واحد معمار سمجھتے ہیں، کا بھی نتیجہ ہوتا ہے۔اس مقالے میں پوری کوشش رائج تصور تاریخ کو 'نظریہ جبر' (Theory of Determinism) سے تعبیر کرتے ہوئے اسے جڑ سے اکھاڑنے پر صرف کی گئی ہے۔تاریخ سے متعلق کئی نظریاتی مقدمات ہیں جو اس مقالے کی تحریر کا محرک بنے۔ان میں سے ایک چارلس ہرشکند (Charles Hirsckind) کا یہ مقدمہ بھی ہے جس کے مطابق 'تاریخ کوئی خلاء نہیں ہے۔' حالانکہ تاریخ ایک خلاء ہے جس پر جدید لادینی معروضیت کے نظریات اور معقولیت کے ذریعے قبضہ کرلیا گیا تھا۔میں ان مقدمات کی نام نہاد آفاقیت پر بھی سوال اٹھانا چاہوں گا جس کے ذریعے تاریخ کے بعض دعوؤں کی توثیق کی جاتی ہے اور بعض دوسرے لمحات اور حالات، جو اکثر تاریخ کے طے شدہ مقدمات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، کو مزعومہ قرار دیا جاتا ہے۔اس مقالے میں میری گفتگو مائیکل فوکو (Michel Foucault) کے خیالات پر بھی مرکوز ہوگی جو ایک معروف اسکالر ہیں جنہوں نے نظریہ جبر کے طور پر تاریخ کے امکانات کو دریافت کیا۔اس کے علاوہ ماپلا بغاوت (Mappila Rebellion) پر بھی گفتگو ہوگی۔

میں دو کہانیاں بیان کرتا ہوں۔ان کہانیوں سے ممکن ہے آپ پہلے ہی واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ اپنے اندر وہ پیغام رکھتی ہیں جس کی بنا پر آپ تاریخ کی تنقیدی سمجھ پیدا کر سکتے ہیں۔اکتوبر 1843 میں کارپرت کرشنا پانیکر (Karpratt Krishnappanikar) جو ایک زمیندار تھے، کی ملازمہ جن کا نام چکی (Chakki) تھا اور جن کا تعلق نچلی ذات سے تھا، نے اسلام قبول کرلیا اور اپنا نام عائشہ رکھ لیا۔اس زمانے میں نچلی ذات کی خواتین کو اعلیٰ ذات کے زمین داروں کے سامنے اپنی چھاتی چھپانے کی اجازت نہیں تھی۔ممبورم سید علوی جعفری تانگل کے ذریعے اسلام قبول کرنے کے بعد عائشہ اپنے سینے پر کپڑا ڈالنے لگیں اور اسکارف پہننے لگیں۔اگلے روز کرشنا پانیکر نے عجیب منظر دیکھا کہ چکی (عائشہ) نہ صرف اپنی چھاتی کو چھپائے ہوئے ہے بلکہ وہ اسے اس کے نام سے پکار رہی ہے اور اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی ہمت کر رہی ہے۔اس تبدیلی سے کرشنا پانیکر طیش میں آ گئے اور انہوں نے عائشہ کو سزا دینے کا حکم سنایا۔نیز انہوں نے عائشہ کا بالائی کپڑا اپھاڑ کر اس کی توہین بھی کی۔یہ خبر مبورم سید علوی جعفری تانگل تک پہنچی۔ان کے بعض لوگوں نے غصے میں آکر کرشنا پانیکر سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور 19 اکتوبر 1843 کو ان میں سے ایک نے پانیکر کا قتل کر دیا۔برطانوی پولس نے قاتلوں کو تلاش کرنا شروع کیا اور 24 اکتوبر کو ایک انکاؤنٹر میں ان تمام کو ہلاک کر دیا۔بعد میں ماپلا سماج میں ان لوگوں کو شہید کے طور پر یاد کیا گیا اور ان کی یاد میں مرثیے لکھے گئے۔

دوسری کہانی، تھوپیاٹا کوچوکایان مسلیار، ایک نومسلم جن کا تعلق

چیروما(Cheruma)ذات سے تھا، اسلامی علوم حاصل کرنے کے شوقین تھے۔ فاؤسیٹ(Fawcett) کی روایت کے مطابق ایک دن لکڑی کے چپل پہن لینے کی وجہ سے تھوورادھیکار(اعلی ذات سے تعلق رکھنے والا ایک زمیندار) نے ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا اور انہیں دھمکی دی کہ چوں کہ ان کا تعلق چیروما ذات سے ہے اس لیے وہ لکڑی کے چپل نہیں پہن سکتے اور اگر آئندہ کبھی انہوں نے اس کی ہمت کی تو انہیں زدوکوب کیا جائے گا۔ ونٹر بوتھم(Winterbotham) کی روایت کے مطابق زمیندار نے انہیں اس کا راستہ 'ناپاک' کرنے کی وجہ سے بھی ٹارچر کیا۔ ابتداء میں انہوں نے سوچا کہ زمیندار ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، نچلی ذات کا ہونے کی وجہ سے انہیں لکڑی کے چپل پہننے کا حق نہیں ہے۔ البتہ بعد میں مسلیار کو محسوس ہوا کہ یہ توہین دراصل ان کی مسلمان شناخت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی اہلیہ سے کیا اور اس بات پر سخت ندامت کا اظہار بھی کیا کہ وہ بروقت اس توہین کا جواب نہیں دے سکے۔ اس توہین نے آخرکار چوکایان مسلیار کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ساتھی ماپلا افراد کو زمیندار کے خلاف منظم کریں، یہ تنظیم ایک متشدد شورش وہنگامے پر منتج ہوئی۔ باغیوں میں سے ایک، جس نے شورش سے پندرہ گھنٹے قبل ہی اسلام قبول کیا تھا، پولس کے ذریعے مارا گیا۔

ان واقعات کو سامراجی(Colonial)، مارکسی(Marxist) اور قوم پرست(Nationalist) تاریخ نگار 'مذہبی جنون'(Fanaticism) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک ایسے تصور تاریخ جس میں تاریخ کو ایک ایسی تھیوری کے طور پر سمجھا جاتا ہے جو چند مخصوص تصورات یا بیانیوں کی ہی شہادت دیتی ہے، پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مقالہ تاریخ کے اسی تصور پر نظر ثانی کرنے کے لیے ہے جس میں تاریخ کا تسلط تمام علوم پر قائم ہے اور یہی وہ تصور ہے جو علم کے دائرے سے خدا، روح اور غیب کو نکال باہر کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ایم ٹی انصاری نے ولیم لاگن کی ماپلا طبقہ کی تاریخ پر جو تجزیہ کیا ہے، اس کی توجیہ کا ایک ذریعہ ہے۔ ایم ٹی انصاری ماپلا طبقہ کی تاریخی اصل کے حوالے سے موجود تجسس آمیز ابہام کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس کے باوجود تاریخ کو تاریخ کے وجود کی علامت کے طور پر لکھنے کی لاگن(Logan) کی کوشش کو سراہتے ہیں۔ ماپلا بغاوت کے پس پردہ اسباب، علل اور عوامل کے بارے میں مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسٹیفن ڈیل (Stephen Dale) بغاوت کو 'علاحدگی پسند گروہ' کی بغاوت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ ایک ایسا گروہ ہے جو جہاد کے لیے خودکش عزائم رکھتا ہے۔ ڈیل ماپلا طبقہ کی علاحدگی پسند ذہنیت کی مختلف مثالیں تراشتے ہیں جسے مذہبی خودکش جہاد کے تصور سے پرجوش بنایا گیا تھا۔ ڈیل کی رائے کہ جواب میں پانیکر کہتے ہیں کہ بغاوت کے اسباب وعلل پر گفتگو کرتے ہوئے ڈیل بغاوت کے مادی اور سماجی نتائج کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب کہ سامراجی ذہنیت رکھنے والے تاریخ نگار اس پر اپنی استشراقی ذہنیت سے نظر ڈالتے ہیں، اور بغاوت کو 'مذہبی انتہاپسندی' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مارکسی تاریخ نگار، بشمول پانیکر، گنگادھرن اور تھراکن، اس کی مارکسی توجیہ کرتے ہوئے ماپلا عوام کی اس وقت کی تاریخی-سماجی-معاشی بدحالی کو بغاوت کا اصل سبب قرار دیتے ہیں۔ کوئی بھی تاریخ نگار ہو، سب نے ماپلا بغاوت کے سبب کے طور پر مشترکہ طور پر دو ہی چیزیں پیش کی ہیں یا تو 'مذہبی انتہاپسندی' یا 'معاشی بدحالی'۔

اگرچہ کہ مذکورہ بالا مورخین یا تو طبقاتی ہیئت اور اس سے متعلق سماجی عدم مساوات کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا خلافت موومنٹ اور قومی تحریک آزادی کو ماپلا بغاوت کی اصل علت قرار دیتے ہیں، اس 'حقیقت' پر ان سب کا اتفاق ہے کہ یہ دراصل ماپلا افراد کی مذہبی انتہاپسندی تھی کہ جو بغاوت پر منتج ہوئی۔ یا صاف لفظوں میں کہا جائے تو اصل بات یہ ہوگی کہ تحریک آزادی اور کسانوں کی شورش (Peasant Insurgency) کے برخلاف، جن کی توجیہ کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے، ماپلا افراد کا 'مذہبی جنون' ناقابل توجیہ ٹھہرا۔ ہرچند کہ ابتدا میں ہندو حضرات خلافت موومنٹ کا ایک اہم حصہ تھے (قوم پرستانہ بیانیہ)، یہ بغاوت اچانک ہندو زمینداروں کے خلاف ہوگئی (کسانوں کی شورش کا بیانیہ) اور بالآخر یہ جنوبی مالابار کے ماپلا سماج کی تحریک بن کر رہ گئی (مذہبی کرن)۔ حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مالابار کے علاقہ میں، جو ماپلا تحریک کا مرکز تھا، خلافت موومنٹ کے اثرات انتہائی کم تھے۔ ایم ٹی انصاری کی تحقیق دراصل اس سوال کے ارد گرد گھومتی ہے کہ ماپلا بغاوت کے اسباب پر صحیح تجزیہ کس کا ہے؟ مارکسی تجزیہ جس کے مطابق معاشی بدحالی اصل سبب تھا؟ قوم پرستانہ تجزیہ جس میں تحریک آزادی کے بیانیے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں؟ یا سامراجی تجزیہ جس کے مطابق اصل سبب مذہبی انتہا پسندی تھی؟ اس کے باوجود مذہبی انتہاپسندی(Fanaticism) کی اصطلاح کا استعمال اکثر اسلام کے نام کے ساتھ ہوتا رہا، درآں حالیکہ دوسرے علاقوں، مثلا شمالی مالابار، کے مسلمان اس بغاوت میں پورے طور پر شامل بھی نہیں تھے۔ طبقاتی کشمکش تاریخی طور پر قابل توجیہ تھی (گنگادھرن، پانیکر اور ای ایم ایس کے مطابق)، مذہب بھی اپنے مخصوص معنوں میں کسی حد تک ذمہ دار تھا (پانیکر کے مطابق) اور قومیت سب سے بڑے سبب کے طور پر سامنے آئی۔ اس طرح کے ہر تجزیے میں جس کا مقصد ماپلا سماج کے 'ارتکاب کردہ' تشدد کا نقشہ بڑھا چڑھا کر کھینچنا ہوتا ہے، 'مذہبی انتہاپسندی' کو مرکزیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایم ٹی انصاری کی کوشش ہے کہ وہ تاریخی طور پر بتا سکیں کہ اس مذہبی انتہاپسندی کا جھوٹ سامراجی مورخین نے گھڑا ہے۔

MUHAMMED SHAH S
Independent Researcher, Kerala
Email:shahmhd.00@gmail.com

نظر

جناح کے ساتھ ہندوستانی مؤرخین کی زیادتی

شرجیل امام

یہ صحیح ہے کہ تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی مسلمانوں کا ہوا، لیکن اس کے لئے جناح یا مسلم لیگ کو قصوروار ٹھہرانا تاریخ کی صحیح قرائت نہیں ہے۔

جب بھی محمد علی جناح خبروں میں آتے ہیں، ہندوستانی مسلمان اپنے ہندوراشٹروادی دوستوں کے عدم تحفظ کے جذبات کو بغیر کسی بنیاد کے بڑھاوا دینے لگتے ہیں اور ملک اور کمیونٹی کو نقصان پہنچانے کے لئے پاکستان کے بانی کی تنقید کرنے کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ ایسا تب بھی ہوا جب 2005 میں ایل کے آڈوانی نے ان کے مزار کی زیارت کی تھی۔ ایک دہائی کے بعد، ایسا ایک بار پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ جدید ہندوستانی لوگ اور جناح کے درمیان کا رشتہ کافی الجھا ہوا ہے۔ ان کے تئیں، خاص طور پر ہندوؤں کا رویہ زبردست غصے اور پھٹکار کا ہے۔ جناح کی وطن پرستی کا پس منظر اس میں ایک اور پہلو جوڑ دیتا ہے۔

ان کو ایک ایسے انسان کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جس نے کرسی پانے کے ذاتی مقصد میں فرقہ وارانہ کیمپ کا دامن تھام لیا اور جس کی وجہ سے یہ ملک تقسیم ہوا۔ لیکن، نسلوں سے پڑھائے جا رہے سبق کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں میں آج بھی تقسیم اور جناح کی کچھ یادیں بچی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کے لئے جناح تقسیم کے مرکزی کردار ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پچھلی صدی میں 'مسلم ہندوستان' کے سب سے عظیم رہنما بھی ہیں، جنھوں نے برٹش ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک لاکھوں مسلمانوں کو جمع کر کے مسلم لیگ کو ایک قومی پارٹی بنایا۔

جناح کی تضاد والی امیج کو ایک دوسرے کے برعکس رکھنے میں قدرتی طور پر چھپی کشیدگی، وقت بہ وقت سطح پر آتی رہتی ہے، جیسا کہ ایک بار پھر اے ایم یو کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ وہاں جناح کی تصویر 1938 سے ہے، جو ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ جناح کی اپنی ایک خاص شناخت 'مسلم ہندوستان' کے سب سے اہم رہنماؤں میں سے ایک کے طور پر تھی۔ یہ داخلی انتشار اور شورشرابا اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستان کی عوام کو تقسیم سے پہلے کی اٹھا پٹک سے بھرے دس سالوں میں چلی بحثوں یا پاکستان کی تعمیر کی تحریک کے

بحث کے مرکز میں ہیں۔ کیا میرے پڑوسی کو بغیر کسی لیاقت اور پابندی کے میرے بدلے قانون بنانے کا حق صرف اس لئے ہے کہ وہ میرا پڑوسی ہے؟ کیا دو کمیونٹیز کو ایک ملک کہا جا سکتا ہے، جب وہ آپس میں شادی کی بات تو دور، ایک ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتے ہیں؟

کیا اقلیتی کمیونٹی کو، جن کے خلاف اکثریت کمیونٹی میں تعصب لبالب بھرا ہو، اپنے سارے حقوق کی سپردگی اکثریت کمیونٹی کے رہنماؤں کے جھوٹے دلاسے کی بنیاد پر کر دینا چاہیے؟ کیا ایک مضبوط مرکز میں اقلیتوں کو ویٹو کا حق دئے بغیر اکثریت کمیونٹی کے تسلط کی اجازت ہونی چاہیے، جبکہ وہ اس بڑے براعظم میں آپ سے تین گنی تعداد میں ہو؟ کیا اکثریت کمیونٹی تین چوتھائی اکثریت ہونے کی طاقت پر آئین میں یک طرفہ طریقے سے ترمیم کر سکتا ہے؟ کیا ان افکار کے مدنظر کچھ ریاست، مثلاً، شمال مغرب اور مشرق کی ریاست الگ ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کو ڈر ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی اور غلط سلوک کیا جا سکتا ہے؟

ان سارے سوالوں پر بڑے سے بڑا آزاد خیال بھی ایک کٹر وطن پرست بن جاتا ہے اور ہندوستان کی یکجہتی اور عوام کے بھائی چارہ کی بات کرنے لگتا ہے۔ لیکن میرا ماننا ہے کہ یہ سوال ایک اکثر ہونے والی بڑی بحث کا صرف ابتدائی پوائنٹ ہیں اور جیسے جیسے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بد تر بنتی جائے گی، یہ بحث بار بار ہوگی۔

جناح پر واپس لوٹتے ہوئے ہم یاد کر سکتے ہیں کہ مسلم لیگ کی کمان سنبھالنے کے بعد انہوں نے دو انتخابات میں پارٹی کی قیادت کی۔ کانگریس نے 1937 میں ہندو ووٹروں کو منظم کرتے ہوئے 70 فیصد سے زیادہ ہندو ووٹ اپنے کھاتے میں ڈال لیا، لیکن مسلم ووٹ یونینسٹ پارٹی، مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی اور کرشک پرجا پارٹی جیسی کئی علاقائی پارٹیوں میں بٹ گیا تھا۔ الانکہ، مسلم لیگ واحد پارٹی تھی، جس کو پورے ہندوستان میں ووٹ ملے اور جس کے کھاتے میں 10 فیصد مسلم ووٹ گئے۔ اس پوائنٹ پر کانگریس نے مسلم جماعتوں کے ساتھ کسی بھی اتحاد کے امکان کو خارج کر دیا۔ کئی کانگریسی اور جماعتی مسلمانوں نے اس کے بارے میں لکھا بھی ہے۔ اتر پردیش اور بہار جیسے مسلم اقلیت ریاستوں میں ان کے دو سالوں کی حکومت کے دوران مسلموں کے خلاف تشدد میں اضافہ دیکھا گیا اور مسلمانوں کے درمیان مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ یہ یاد کرنا مفید ہوگا کہ مسلم لیگ کو مسلم پارٹیوں کو ہرانا تھا، کیونکہ کانگریس کو استثنیٰ کے طور پر ہی کوئی مسلم ووٹ مل رہا تھا۔ ان سالوں میں جناح نے جھارکھنڈ کی ایس ٹی پارٹیوں اور بی آر امبیڈکر جیسے ایس سی نمائندوں کے ساتھ اتحاد بنانے کی پیشکش کی اور اس کو عملی شکل بھی دی۔

1946 میں، جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر جانے کی تیاری کر رہے تھے، مسلم الیکشن بورڈ جناح کے پیچھے جمع ہو گیا تھا اور مسلم لیگ کو پورے برٹش ہندوستان میں قریب 80 فیصد مسلم ووٹ ملے۔ کانگریس اسی امکان سے ڈری ہوئی تھی، کیونکہ نہ کے برابر مسلم ووٹ ملنے کے باوجود یہ مسلموں کی نمائندگی کرنے کا دم بھر رہی تھی۔ اس طرح آخری مرحلے کی بات چیت میں، جناح تمام مسلم سیاسی رجحانوں کے مشترکہ رہنما کے طور پر ابھر کر آئے اور انہوں نے ان مانگوں کو دہرایا، جو دہائیوں سے بات چیت کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر مانگ کانگریس کو منظور نہیں تھیں اور انہوں نے کیبنیٹ مشن اسکیم کو بھی قبول کر لینے کے بعد ٹھکرا دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے، جس کا ذکر مولانا آزاد نے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں کیا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے یہ دلیل دینا مشکل ہے کہ مسلمانوں کے پاس تقسیم یا خانہ جنگی کے علاوہ اور بھی کوئی اختیار بچا ہوا تھا؟

1946 انتخاب

ایک نکتہ جو قوم پرستانہ مباحثے میں تکرار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے یہ ہے کہ 1946 کے انتخاب میں ووٹنگ محدود تھی، اکثریت نے چوں کہ حق رائے دہی کا استعمال نہیں کیا تھا اس لئے مسلم لیگ کی فتح ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات کی صحیح طور پر نمائندگی نہیں کرتی۔ مسلمان درحقیقت 'سیکولر' تھے اور کانگریس کے حامی تھے۔ اکثر یہ حوالہ دیا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والوں کا تناسب ہندوستانی آبادی کا محض 11 یا 12 فیصد تھا۔ حالانکہ یہ اعداد و شمار بھی بے معنی ہیں کیوں کہ ان میں بچوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر ہم بالغ عمر آبادی کو پیش نظر رکھیں تو ووٹ دینے والوں کا تناسب 20 ہے۔ مزید یہ کہ ووٹ دینے والی خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کافی کم تھی۔ اگر ہم اعداد و شمار کا صنف کی بنیاد پر جائزہ لیں تو 10 فیصد سے کم خواتین ووٹ دے رہی تھیں، جب کہ 40 فیصد سے زائد مرد الیکٹوریٹ کا حصہ تھے۔ اگر ہم اعداد و شمار کو اس طرح دیکھیں تو ہم ووٹنگ کے تناسب کو معمولی یا غیر اہم نہیں قرار دے سکتے۔ مسلمانوں کے تناظر میں، برطانوی ہندوستان کے 4 کروڑ میں سے ایک کروڑ سے زیادہ افراد کا نام ووٹنگ لسٹ میں رجسٹرڈ تھا۔ جن میں مردوں کی غیر معمولی اکثریت تھی۔ جن سیٹوں پر انتخاب ہوا ان میں جناح کی مسلم لیگ نے مسلمانوں کی طرف سے ڈالے گئے کل ووٹ کے 75 فیصد ووٹ یعنی کل 4.5 ملین ووٹ حاصل کیے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگ نے وہ سیٹیں بھی جیت لیں جہاں مقابلہ نہیں تھا۔

بارے میں ڈھنگ سے پتا نہیں ہے۔

اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم پروپیگنڈا سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور راشٹر واد پر زبانی جمع خرچ کرنے کی سماجی ضرورت کے تحت ردعمل دیتے ہیں۔ جناح پر پڑے راز کے پردے کو ہٹانے اور ایسے داخلی انتشار کو سلجھانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ تقسیم پر ایک وسیع بحث کو ہمارے تعلیمی ڈھانچے کا حصہ بنایا جاتا۔ لیکن، (جناح کو) تقسیم کے وقت ہوئے تشدد کا قصوروار ٹھہرا دیے جانے کی حقیقت نے ان جیسی تاریخی شخصیت کے بارے میں جاننے کے راستے کو بند کر دیا ہے۔ یہ تناسب سیاسی نمائندگی کی جائز مسلم مانگوں اور توقعات کے لئے جگہ نہ بنا پانے کی اپنی ناکامیوں کو چھپانے کی کانگریس کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اپنے بچاؤ میں کانگریس 'ایک ملک' کے تکیہ کلام کو ہی بار بار دہراتی رہی ہے اور ملک، کمیونٹی یا جمہوریت جیسے سنجیدہ عہدوں پر کسی فکری بحث کو اس نے ناممکن بنا دیا ہے۔ مسلم نمائندگی، الیکشن بورڈ اور مرکز و ریاست سے متعلق سوال کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جھگڑے کی جڑ تھا۔ یہ وہ مسئلے تھے جن کو لیکر زیادہ تر مسلم پارٹیاں دو دہائیوں سے زیادہ وقت سے کانگریس سے یقین دہانی کی مانگ کر رہی تھیں۔ جناح کے لندن سے لوٹ کر آنے اور 1934 میں مسلم لیگ کی کمان سنبھالنے کے بعد بھی انہوں نے ان مسائل پر کانگریس کے ساتھ کسی سمجھوتہ پر پہنچ جانے کی امید نہیں چھوڑی تھی۔ جناح نے سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے کانگریسی رہنماؤں پر یقین جتانے کی کوشش بھی کی۔ ایسا سمجھوتہ کانگریس کی قیادت کے تئیں ہندوستانی مسلمانوں کے موہ بھنگ کو ٹال سکتا تھا۔

لیکن تقسیم پر بات کرتے وقت ان تین عہدوں پر شاید ہی کبھی بات کی جاتی ہے۔ اس کی جگہ تقسیم کے ہندوستانی بیان میں فرقہ پرستی، Pan-Islamism یا 'نیو مدینہ' جیسے تصورات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ زیادہ تر مسلم پارٹیوں نے حکومت، خدمات اور فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی کی گارنٹی کی مانگ کی تھی۔ انتظامیہ میں مسلمانوں کی ایک متعین حصہ داری طے کرنے کی مانگ کی گئی تھی تاکہ وہ جانبداری کی وجہ سے پیچھے نہ رہ جائیں، جو بار بار ہونے والے مسلم مخالف گروہ بند تشدد کو دیکھتے ہوئے ایک حقیقی خطرہ تھا۔

مومن کانفرنس جیسی کچھ پسماندہ مسلم پارٹیوں نے اور زیادہ حفاظتی تدبیروں اور مسلمانوں کے اندر پسماندہ کمیونٹیوں کے لئے ریزرویشن کی مانگ رکھی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم ہے کہ مسلم لیگ کے صدر کے طور پر جناح نے کانگریس سے فوج میں مسلمانوں کی حصہ داری طے کرنے کی مانگ کی تھی، کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ 'سیاسی حق، سیاسی طاقت سے ملتے ہیں' اور اگر دونوں کمیونٹی 'ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے سے ڈرنا' نہیں سیکھتے ہیں، تو کوئی بھی سمجھوتہ کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تیسرا اہم مدعا مستقبل کے ہندوستان میں مرکز کو دی جانے والی مربوط اہمیت کا تھا۔ مسلم اکثریت والی ریاستوں نے زیادہ حق دئے جانے کی مانگ رکھی جبکہ کانگریس دلی میں ایک زیادہ مضبوط مرکز والی حکومت کی حمایت میں تھی۔ ویٹو کا مدعا اس مرکز، ریاست سے متعلق مسئلے سے ہی جڑا ہے۔ اگر مضبوط مرکز والی حکومت میں پارلیامنٹ میں ہندوؤں کی تعداد مسلموں کے تناسب میں تین گنی ہو اور ایک ایسا بل آتا ہے جس کی حمایت میں سارے ہندو ووٹ کرتے ہیں اور کوئی بھی مسلم ووٹ نہیں کرتا ہے، تو وہ بل تین چوتھائی اکثریت سے منظور ہو جائے گا۔ اس طرح سے کسی بھی مسلم نمائندے کے ذریعے ووٹ نہ کئے جانے کی حالت میں بھی اس بڑے برصغیر کے پورے نظام کو متاثر کرنے والا کوئی قانون بنایا جا سکتا تھا۔ جناح اس کو متناسب طریقے سے جمہوری نہیں مانتے تھے اور انہوں نے کہا کہ یہ 'بیلٹ باکس کے سہارے 'ایک ملک کے ذریعے دوسرے ملک پر حکومت کرنے جیسا ہے اور اس سے بچاؤ کا ایک ہی راستہ مسلم کمیونٹی کو حکومت میں ویٹو طاقت دینا ہے۔

اوپر کی ساری مانگوں کا تعلق فرقہ وارانہ حقوق سے تھا۔ کانگریس نے اس لفظ کو اس سطح تک بدنام کر دیا کہ ہم اس لفظ کے پرانے اور زیادہ منطقی معنی کو ہی بھول گئے ہیں۔ فرقہ وارانہ کا معنی فرقے سے جڑا ہوا ہے۔ نوآبادکاری کے دور میں کئی مفکروں اور سیاست دانوں نے اسی معنی میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ لیکن کانگریس نے اس لفظ کا استعمال کچھ اس طرح سے کیا کہ ہم فرقہ وارانہ کو ایک منفی چیز ماننے لگے ہیں۔ 'فرقہ وارانہ' کا معنی سامنے والے کے خلاف نفرت یا تعصب رکھنا نہیں ہے۔ اس کا معنی، اپنی پہچان کو اپنے فرقے سے جوڑنا ہے۔

برٹش ہندوستان میں کئی ایسے فرقوں کی رہائش جن میں آپس میں شادیاں نہیں ہوتی تھیں، جو عمودی اور افقی طور پر منقسم تھے۔ مسلم اور ہندو ایسے دو عمودی منقسم فرقہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کے اندر افقی ذات کی تقسیم بھی تھی۔ ہم آج بھی بینیڈکٹ اینڈرسن کی کتاب Imagined Communities کے اکادمی معنی میں ایک ملک نہیں ہیں۔ جناح کا کہنا تھا کہ ہم ایک ملک تبھی بن پائیں گے، جب ہم اقلیتی کمیونٹی کو محفوظ ہونے کا احساس دلا پائیں گے۔ اقلیتوں کی طرف سے بولنے والی پارٹی ایک فرقہ وارانہ پارٹی تھی۔ کانگریس نے 'فرقہ وارانہ' کا معنی بدل دیا اور اس کو ایک حقارت بھرا لفظ بنا دیا۔

اسی طرح سے اس نے 'سیکولرزم' لفظ کا غلط معنی نکالا اور اس کا غلط استعمال کیا اور اس کو مسلموں کو کسی بھی آئینی طاقتوں اور حقوق سے محروم رکھنے کا اوزار بنا دیا۔ اس طرح سے خود مختاری کا مسئلہ، فرقہ اور ملک کے درمیان کے رشتے کو لیکر بحث، یا کیا 'قوم' کا مطلب فرقے سے ہے یا ملک سے ہے، یہ سوال تقسیم کی

محدود ووٹنگ کے آرگیومنٹ کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسے اعداد وشمار نہیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر ہم ووٹ نہ دینے والوں کی ترجیحات کا اندازہ لگا سکیں۔ کچھ ریاستوں میں جہاں مسلم لیگ مضبوط تھی، مثلاً بنگال یا مدراس، پارٹی کے لیے ملتے جلتے نتائج آسکتے تھے، اور دوسری ریاستوں میں یہ چند سیٹیں جیت سکتی تھی۔ لیکن مسلم لیگ نے محدود لیکن بے حد اہمیت کی حامل ووٹنگ میں جو غیر معمولی برتری حاصل کی، اس کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مکمل ووٹنگ نتائج پر کوئی قابل ذکر اثر ڈالتی۔ جب تک اس موضوع پر مزید کوئی تحقیق نہیں آجاتی، 'محدود ووٹنگ' کا دعوی ایک کمزور دعوی ہے جو تنہا یہ ثابت کرنے کے قابل نہیں ہے کہ مسلمانوں کی معتد بہ تعداد نے مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی۔ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں جناح پر ہونے والی بحثوں میں کچھ چیزوں کو بار بار دوہرایا جاتا ہے؛ ان میں مذہبیت کی کمی، ان کی فرقہ پرستی، کس طرح انگریزوں نے اپنی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی کے تحت ان کا استعمال کیا اور کس طرح سے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اور کمزور کر کے ان کا نقصان کیا۔

غیر مذہبی ہونے کے الزام کو ثابت کر پانا مشکل ہے، کیونکہ ایسی ذہنیت کو ناپنے کا کوئی معیاری پیمانہ نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کو لیکر ان کا خیال کیا تھا، یا اسلام کیسے سماجی ڈھانچوں کو جنم دیتا ہے یا مسلم ممالک کی ارضی سیاسی حالت وغیرہ کو لیکر ان کی سمجھ کا اندازہ لگانے کے لئے ان کی تقریروں کو پڑھنا اور ان کے لمبے حکومتی کیریئر کے دوران ان کے ذریعے مجوزہ اصلاحوں کے بارے میں جاننا کافی ہوگا۔ ان کی استعماری تعلیم کو اکثر ہندوستانی سچائیوں سے ان کے کٹے ہونے کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس الزام میں بھی کوئی دم نظر نہیں آتا، کیونکہ زیادہ تر اعلیٰ رہنما غیر ملک سے تعلیم لیکر لوٹے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر گفتگو کی، جناح کی فرقہ پرستی مثبت فرقہ پرستی تھی اور اس کو اس لفظ کے ہم عصر معنی کے پرزم کے سہارے نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ ہندوستان ایک ملک ہے، جیسا کہ ان کے ذریعے بار بار استعمال کئے جانے والے لفظ 'براعظم' اور 'برصغیر' سے معلوم پڑتا ہے۔ وہ کمیونٹی کے اس براعظم میں ایک کمیونٹی کی نمائندگی کر رہے تھے اور اس عمل میں وہ صرف تعداد کی نظر سے کمزور کمیونٹی کے حقوق کو متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ ایک بار بار لگایا جانے والا الزام ہے اور باقی چیزوں کے علاوہ مختلف انتخابی بورڈ پر سوال اٹھاتا ہے۔ میں نے مختلف انتخابی بورڈ کے اوپر گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ، مومن کانفرنس بھی مختلف انتخابی بورڈ کے چرمرانے کے بعد اپنا وجود نہیں بچا سکا اور پسماندہ مسلمانوں کی تنظیم بھی سکیورٹی شیلس کو ہٹا لئے جانے کے بعد نہیں ٹک سکے۔

دوسری طرف مشرقی پاکستان کے پہلے انتخابات میں پاکستان کانگریس نے 30 سے زیادہ سیٹوں پر جیت درج کی، کیونکہ وہاں مختلف انتخابی بورڈ کو بنائے رکھا گیا تھا۔ اس لئے یہ صحیح ہے کہ انگریز مسلموں اور ہندوؤں کو منقسم کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف انتخابی بورڈ یا اوپر گفتگو کئے گئے حاکمیت کے مسائل کی حقیقت میں کوئی بنیاد نہیں ہے اور یہ صرف اقتدار کے لئے حکمراں طبقے کے ذریعے کی جانے والی چالبازی ہے۔

آخر میں، تقسیم کے ذریعے اور کمزور کر دئے گئے ہندوستانی مسلمانوں کی شکایتوں پر آتے ہیں۔ پہلی بات، یہ صحیح ہے کہ تقسیم سے ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا، لیکن اس کے لئے جناح یا مسلم لیگ کو قصوروار ٹھہرانا تاریخ کا صحیح سبق نہیں ہے۔ جناح کا کہنا تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم تعداد کے حساب سے 15 فیصد ہیں یا 25 فیصد ہیں۔ جب تک ہمارے لئے خصوصی حفاظتی تدبیر نہیں کی جائے گی، ان کے پاس اقتدار پر اجارہ داری قائم کرنے کے سارے وسائل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مسلم اکثریت ریاستوں نے ہندو تسلط والے مرکزی ہندوستان میں رہنے کی جگہ الگ ہونے کا فیصلہ کیا، کیونکہ ان کو اس کے علاوہ کوئی اور اختیار نظر نہیں آیا۔ اس لئے تقسیم کے لئے ان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، یہ دراصل کانگریس کے ذریعے تیار کر دئے گئے حالات کا نتیجہ تھا۔ دوسری بات، تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تکلیف جناح کی دین نہیں ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو قدامت پسند ہندو طاقتوں کے علاوہ جابرانہ ریاست کے ذریعے بھی مارا گیا ہے، جس نے ان کو پہلے دن سے ہی ہر میدان میں نمائندگی سے دور رکھا۔

جناح کے پاکستان میں بھی ہندوؤں کے لئے مختلف الیکشن بورڈ کا انتظام کیا گیا، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کو اس سے محروم رکھا گیا۔ ہمارا نقصان جناح نے نہیں، بلکہ کانگریس اور بی جے پی جیسے اس کے جانشینوں نے کیا ہے، جنہوں نے ہمارا استحصال کیا ہے۔ جناح نے جو سوال اٹھائے، وہ آج بھی بامعنی ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت کمیونٹی ہونے کے ناطے ہندوستانی مسلمانوں کو اکثریت پسند جمہوریت سے کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان کروڑوں گھرے ہوئے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد آنے والی صدیوں میں تکثیری جمہوریت کے معنوں کی تشریح کرے گی۔ اے ایم یو سے جناح کی تصویر نہیں ہٹائی جانی چاہیے۔ بلکہ ہمیں ایسی اور ہزاروں تصویروں کی ضرورت ہے۔ (اس مضمون کا بیشتر حصہ پہلے دی وائر کے لیے لکھا گیا۔)

SHARJEEL IMAM
PhD Modern History
Jawahar Lal Nehru University
New Delhi
Email:Sharjeel.imam@gmail.com

نصابی کتب کے ذریعے تاریخ ہند کو مسخ کرنے کی کوشش: ایک مطالعہ

دلشانہ سمیہ

پچھلے پچاس سالوں میں ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے ایک نیا بیانیہ سامنے آیا۔ جس میں ہندو شناخت کو نمایاں کیا گیا اور دیگر اقلیتوں کو ملک میں گھس پیٹھوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ ہندو قوم پرستوں نے ہمیشہ سے ہندوستانی تاریخ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور تاریخ سے چھیڑ چھاڑ کر کے اپنے ناجائز ایجنڈہ کی انجام دہی کے لئے مستقل کوشاں رہے ہیں۔ جہاں آج وہ تعلیمی نصاب پر حملہ آور ہیں وہیں تعلیمی اداروں پر قبضہ جمانے اور اہل تر اسکالرس کی عدم بحالی کے ذریعہ پوری تعلیم کو زہر آلود کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں سنگھ پریوار نے ہندوستانی تاریخ کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے ازسرنو لکھنے کا کام کیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مختلف ریاستوں کے نصاب تعلیم میں تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔

تاریخ کے اس فرقہ وارانہ پروپگنڈے کا آغاز غلط بیانی سے کیا گیا کہ آریہ خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی ہندوستان کے اصل باشندے ہیں اور ہندوازم کی جڑیں آریہ ویدک مذہب سے جا کر ملتی ہیں۔ تاریخ کی یہ تصویر اس دعوی کے ثبوت کے طور پر پیش کی گئی کہ ہندوستان دنیا کی تمام تہذیبوں کا مرکز ہے۔ مزید یہ کہ آریائی سماج پانچ ہزار سال قبل مسیح سے ہندوستان میں بستا ہے۔ حالانکہ صحیح تحقیقات کے مطابق آریائی خاندان پندرہ سو قبل مسیح سے ہندوستان میں مقیم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تانبے کی دریافت سب سے پہلے ہندوستان میں 3700 قبل مسیح میں ہوئی، پہلا رسم الخط 3500 قبل مسیح میں رائج ہوا اور مہا بھارت کی جنگ 3100 قبل مسیح میں لڑی گئی۔ یہاں تک کہ فرقہ پرست تاریخ نگاروں کا ماننا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب اصلاً سرا سوتی تہذیب ہے جہاں آریائی نسل جا کر ملتی ہے۔ چنانچہ وہ آریائی تہذیب کے غلبہ کے علاوہ تمام حقائق کو، یہاں تک دراوڑ تہذیب کی حقیقت کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔

اس فرقہ وارانہ تاریخ کے ذریعہ عہد وسطی کے مسلمانوں کی یہ تصویر پیش کی گئی کہ وہ غیر ملکی، بے رحم اور وحشی حملہ آور تھے جنہوں نے ہندوستان کے سنہرے عہد کو نیست و نابود کر دیا۔ انہوں نے یہ الزام عائد کیا کہ مسلمانوں نے ہندوں کا بے رحمی کے ساتھ قتل عام کیا۔ لیکن اس الزام کو ثابت کرنے کیلئے ان کے پاس کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (RSS) نے مسلمانوں کی تعمیر کردہ تاریخی عمارتوں کی تاریخ کو بھی مسخ کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔ ان کے دعوی کے مطابق لال قلعہ اور تاج محل پہلے مندر اور ہندووں کے تعمیر کردہ مذہبی مقامات تھے۔ جنہیں مسلم ظالم و جابر حکمرانوں نے مسمار کر دیا اور وہاں اپنی عمارتیں تعمیر کیں۔

اس مسخ شدہ تاریخ کو اسکولی نصاب میں شامل کیا گیا جو ریاستی اور ملکی دونوں سطحوں پر اسکولوں میں پڑھائی جانے لگی۔ راجستھان کی جماعت ششم میں جواہر لعل نہرو اور دیگر کانگریسی لیڈران کو تاریخ کے صفحات سے ہٹا دیا گیا۔

حالانکہ نصاب میں موہن داس کرم چند گاندھی، سبھاش چندر بوس، لالہ لاجپت رائے، بھگت سنگھ اور بال گنگادھر تلک کا ذکر کیا گیا ہے۔ نصاب کے گزشتہ ایڈیشن میں 'قومی تحریکات' کے سبق میں نہرو کا ذکر نمایاں طور پر موجود تھا۔ اور اس سے پہلے بھی نصاب میں 'تاریخ آزاد بھارت' کا آغاز پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے حکومت کی تشکیل میں کردار سے ہوتا رہا۔ راجستھان بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے ماتحت اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ ٹریننگ (SIRT) نے نصاب کا از سرنو جائزہ لیتے ہوئے نصاب میں تحریفات کیں۔ حق پسند ماہرین تعلیم نے اس اقدام کو "تحریک آزادی ہند کا ہندوکرن" سے تعبیر کیا ہے۔ جس میں ساورکر کو انقلابی، عظیم محب وطن اور بہترین تنظیم پرست کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ جواہر لعل نہرو کو جماعت دہم کے سوشل سائنس کے نصاب سے خارج کرنے پر ریاستی وزیر تعلیم واسودیو دیونانی نے یہ بیان دیا کہ "ہر ہیرو کو نصاب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"

تحقیق کے مطابق اس ترمیم شدہ نصاب تعلیم میں م۔ک۔ گاندھی کے قتل اور گوڈسے (رکن آر ایس ایس) کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ملتا۔ اسی سال حکومت راجستھان نے جماعت دہم کے نصاب تاریخ میں تحریفات کو منظوری دی جس میں سولہویں صدی میں لڑی گئی ہلدی گھاٹی کی جنگ کی غلط تصویر پیش کی گئی۔ یہ دعوی مہارانا پرتاب سنگھ نے مغل بادشاہ اکبر کو شکست فاش دے دی تھی، 16ویں صدی میں جنگ کے ایک سال بعد 18، جون 1576 کو پرتاب سنگھ کے ذریعے ہلدی گھاٹی کے قریب واقع دیہاتوں میں تقسیم کی گئی جاگر کے زمینی ریکارڈ کی برآمدات پر مبنی ہے۔ مگر تاریخی طور پر اصل فاتح مغل تھے جو اگرچہ کہ مہارانا پرتاب سنگھ کو قید کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے تاہم انہوں نے مواریوں کو شدید چوٹیں پہنچائیں۔ ساتھ ہی حکومت نے یہ بھی حکم دیا کہ "عظیم اکبر" عنوان کے تحت موجود سبق کو حذف کر دیا جائے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن اینڈ ہائیر ایجوکیشن کے تحت اسکولوں میں ہسٹری سبجکٹ کوپریشن (H S C) اور اسٹیٹ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ (SED) کے ارکان نے یہ دعوی کیا کہ 331 سالوں پر محیط پوری مغل تاریخ جماعت ہفتم اور نہم کے لئے غیر متعلق ہے۔ مہاراشٹر میں ترمیم شدہ نصاب تاریخ صرف مراٹھا حکومت اور شیوا کے ارد گرد گردش کرتی ہے۔ گزشتہ نصاب تاریخ میں مغل حکمرانوں اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اب اس میں ترمیم کر کے اسے صرف چند سطروں میں سمیٹ دیا گیا۔ ترمیم شدہ ایڈیشن میں شیوا کو عہد وسطی اور ستائیس سالوں پر محیط اورنگ زیب کے خلاف جدوجہد کا مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا۔ گجرات میں، جو کہ ہندوتوا کی تجربہ گاہ ہے، نصابی کتب بے بنیاد دعوؤں مثلا یہ کہ جینیاتی انجینئرنگ اور ہوائی جہاز قدیم ہندوستانی تاریخ میں موجود تھے، کے علاوہ بہت زیادہ توہمات پر انحصار کرتی ہیں اور رزمیہ افسانوں کو بنیادی مرجع کا درجہ دیتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ محکمہ تعلیمات نے نصاب تعلیم میں ہوئی ترمیمات کے پس پشت کسی سیاسی ایجنڈہ کی موجودگی کا انکار کیا ہے اور یہ دعوی کیا کہ نصاب تعلیم کا جائزہ خودمختار اداروں نے لیا ہے۔ ملک کے مؤقر اداروں، جیسے نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی اور انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ پر نظریاتی قبضہ نے تاریخ کی نصابی کتب لکھنے کے عمل کو متاثر کیا ہے۔ ان کتابوں کو نئے بیانیوں کے نفوذ، تنقیدی سوچ کا فروغ اور تخلیقیت کے نام پر از سرنو مرتب کیا جا رہا ہے۔

چالاکی کے ساتھ بیک وقت یہ تمام اقدامات تاریخ ہند کو ہندو مرکوز بنانے کے لیے کیے گئے۔ دوسری خطرناک حقیقیت یہ ہے کہ اس تعلیمی نصاب کے ذریعہ صرف ایسی نسل تیار کی جا رہی ہے جو فرقہ وارانہ نظریہ کی غلام ہوگی۔ یقینی طور پر اس تعلیمی نصاب کے ذریعہ صرف فالج زدہ ذہن پروان چڑھیں گے۔ آج پورا ملک تاریخ پر ایک منصوبہ بند حملے کو محسوس کر رہا ہے۔ چاہے وہ تاریخی عمارتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کا معاملہ ہو یا شہروں کے ناموں کو بدلنے کا۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ "جب تک شیر کے پاس خود کی تاریخ محفوظ نہیں ہوگی، تاریخ میں ہمیشہ شکاری کو گلوری فائی کیا جائے گا۔"

DILSHANA SUMAYYA PK
Faculty of Usool-ud-deen,
Al Jamia AL Islamiya,
Santhapuram, Kerala
Email:Dilshanasumayya2@gmail.com

مقامِ اقبال، پیغامِ اقبال

ابو عبدالقدوس محمد یحییٰ

توصیف بنام علامہ ڈاکٹر اقبالؒ

جب مسلمانوں نے ترک کیئے احکام المتعال اور پسِ پشت ڈالی شریعتِ سید بشر و صاحب جمال، اور کیئے انہوں نے اقدارِ اسلامی پامال، آیا ان پر بدترین زوال، فرنگیوں نے جب دیکھی یہ صورتحال، چلی انہوں نے شاطرانہ چال، بچھایا عیاری سے ایسا جال، کیئے بغیر جنگ وجدال، کر لیئے شہر کے شہر یرغمال، اور ہو گئے مسلط گروہِ مغضوب وضال، مسلمانوں کے پاس تھی نہ کوئی ڈھال، گزرتے رہے یونہی ماہ وسال، نہیں ملتی جس کی تاریخ میں کوئی مثال، تاتار نے بھی کیا تھا اگرچہ دجلہ وفرات کو خون سے لال، لیکن اب تو ہے نہ رکنے والا زوال، کیونکہ امت تو ہے بس گروہ جُہال، اہل بصیرت تو ہیں بس خال خال، پیدا ہوئے اُس وقت بعض رجال، جن میں سے ایک تھا ڈاکٹر محمد اقبال علیہ رحمۃ المتعال، چمکا افق پر جو مثلِ ہلال، شاعری تھی جس کی با کمال، فکر تھی جس کی پُر جمال، نہیں تھی جس میں حب دنیا و مال، جو تھا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و حضرت بلالؓ، اس پر مخفی نہ تھے قوم کے احوال، جب دیکھا شاہین ہے بغیر پر و بال، بلکہ ادھڑ

اوردوسروں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔اورایسے بااختیار مومن جن کی نگاہیں دوسروں کی تقدیر بدل دیں ان کے زور بازو کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مردمؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؒ کا تصور خودی

اقبالؒ زندگی بخش اورحیات آفریں قدروں کی ہمیشہ حمایت کرتے ہیں۔جس میں انفرادی اوراجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کونہایت خوبی سے سمویا گیا ہے۔وہ فرد کی خودی پر زور دیتے ہیں۔مسلمان کوخودی اور خودشناسی کا درس دیتے ہیں کہ تواپنے مقام کو پہچان یہ کائنات تیرے لئے بنی ہے تواس کائنات یا ملک کے لئے نہیں بنا ہے۔خلق لکم ما فی الارض جمیعا (ترجمہ: زمین (اورآسمان) میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے فراہم کیا) جسے اقبالؒ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے،تونہیں جہاں کے لئے

مگر فرد کی خودی کوضبط نفس اوراطاعت الٰہی کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔فرد کی خودی سوال سے ضعیف ہوجاتی ہے۔اقبالؒ کے نزدیک مومن کے ہاتھ سے اگر سلطنت بھی جاتی رہے تو وہ پرواہ نہیں کرتا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام سے کبھی روگردانی نہیں کرتا۔مسلمان حکومت کے حصول کے لئے دوسری طاقت اوراقوام کی گداگری نہیں کرتا۔مسلمان سلطنت کو کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔جب تک وہ خوداپنے زور بازو اور فضل الٰہی سے حاصل نہ کرے۔اس کے لئے ایسی بادشاہی جودوسری اقوام کے زیرسایہ یامدد سے ملے وہ قومی ذلت ورسوائی کا باعث ہے۔اقبالؒ مسلمانوں کے دوبارہ عروج کے آرزومند تھے لیکن یہ عروج فرنگیانہ تہذیب اپنا کر یا کسی شہنشاہ کی سرپرستی میں حاصل ہو تو یہ ان کے نزدیک گداگری اور کاسہ لیسی کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔جماعت کی خودی دوسروں کی غلامی یادوسروں کا دست نگر ہونے سے حاصل نہیں ہوتی۔اس لئے اقبالؒ حریت اورخواعتمادی پرزوردیتے ہیں:

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

فکراقبالؒ کا ایک خاص پہلو اسلاف کا منہج اور ماضی پر فخر ہے۔ان کا تصورحیات دراصل اسلامی اقدارروایات پر مبنی ہے۔اقبالؒ کے تمام افکار کا دارومدار دین پر ہے۔اقبال کے یہاں یہ چیز محض وجدانی طور پر نہیں بلکہ وہ اس مقام پر جدید وقدیم فلسفہ اور موجودہ سائنسی علوم کا مطالعہ کرنے کے بعد فائز ہوئے ہیں۔اقبالؒ اس حقیقت سے بھی کماحقہ آگاہ ہیں کہ فزکس ودیگر علوم سائنس جن پر موجودہ زمانہ میں اہل یورپ کو ناز ہے ان علوم سائنس کے موجد اللہ کے حضور سجدہ ریزی کرنے والے مسلمان ہی تھے جن کے نقش قدم پر یورپ کے سائنسدان چل رہے ہیں۔نیز یہ تمام سائنس کے کرشمے اسی صدائے بازگشت کُن فکان کی تشریح ہے۔اقبالؒ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو اسلام کی حقیقت اور مسلم کے مقام سے آگاہ ہوجا۔اگر تواپنی حقیقت ومقام اور مقصد حیات سمجھ لے تو تو اس قول مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَدعَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنی ذات کا ادراک کرلیا اسے اپنے خدا کا عرفان حاصل ہوگیا) کے مصداق بن کر گویا خدا کا ترجمان ہوسکتا ہے۔اس راز کو علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

تو راز کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا

وطن پرستی (مذہب کا کفن)

اقبالؒ وطن سے محبت کرتے ہیں۔ہندوستان کی محبت اوراسے آزاد
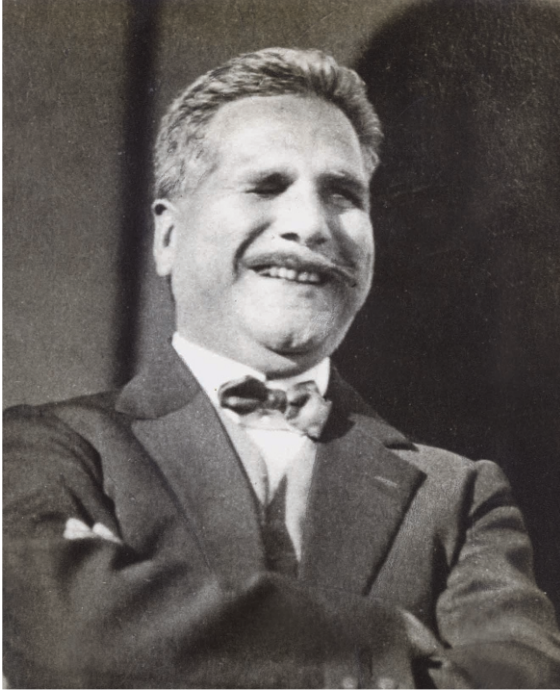
گئی ہے اس کی کھال، لیتے ہیں بس یہ طوطا فال، رہ گئے ہیں صرف ظاہری مقال یعنی جل تو جلال آئی بلا کو ٹال لیکن نہ تھی کوئی عملی صورت حال، اس کو ہوا بہت رنج وملال، دیا الہ آباد میں خطبہ فقید المثال، دکھایا ان کو ماضی کا احوال، کہا ہے یہ قرآن وسنت چھوڑنے کا وبال، دکھائی مسلمانوں کو راہ اعتدال، رہنمائی کی جانب فکر صالح ونیک اعمال، کیا حیات صحابہؓ سے استدلال اور بتایا فلسفہ عروج وزوال، کہا کہ اگر تم مل کر کرو قتال تو کفار کی کیا مجال، کہ چھین لیں تمہارے اموال، جس نے کیا مغربی افکار کا ابطال، ڈاکٹر انصاریؒ نے بھی انہیں کیا خط ارسال، ان سے پوچھا ایک سوال، کیا مغرب سے حاصل کروں علمی کمال، آپ نے دور کیا ان کا اشکال، علوم اسلامیہ کا مغرب سے ملنا ہے محال، چاہتے ہو اگر کوئی کمال، کرو محنت عن دو وآصال، جب ہوا اقبالؒ کا وصال، جان دے کر ہو گیا لازوال۔

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

اقبالؒ کا تصور مومن

اقبالؒ کے نزدیک مومن کی زندگی اسلام کا آئینہ ہے۔ خواہ کتنی مشکلات راستہ میں حائل ہوں، مومن اپنے ارادہ خیر سے ہرگز نہیں ٹلتا۔ خواہ اس کا جان ومال کچھ بھی باقی نہ رہے۔ مومن کے ارادے بلند، عزائم پختہ، مقاصد نیک، دل پاک مثل آئینہ ہوتا ہے۔ اس کا کردار ہر قول وفعل اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کے تابع ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی صراط مستقیم سے نہیں ہٹتا ہے۔ عبادات، رسومات، معاش، تجارت، سیاست، حکومت الغرض دنیا کے ہر شعبہ میں منشاء الٰہی، احکام الٰہی اور خوشنودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقدم سمجھتا ہے۔ اور اسلامی شاہراہ پر گامزن رہتا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اقبالؒ کے نزدیک ''یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم'' زندگی کے جہاد میں مردان خدا کی شمشیریں ہیں۔ یقین کامل (جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ یہ ایمان کی پختگی ہی ہے جس سے انسان مومن بنتا ہے) شریعت اسلام کے اوامر ونواہی، اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عمل پیہم اور محبت (حُبِ الٰہی ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ یہی وہ تلواریں تھیں جن کی وجہ سے درندہ صفت، وحشی اور دنیا بھر کے عیوب میں مبتلا عرب خیر الامم اور بے نظیر قوم بن گئے۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

جہاں تک ظاہری ساز وسامان کا تعلق ہے تو کفار کے برعکس مومن کو اس

شمشیر کی اس قدر ضرورت نہیں جتنی یقین کامل کی ہے جس میں اس کا عقیدہ پختہ ہو۔ ظاہری ہتھیار اور تلوار کے بغیر بھی مومن دل میں وسوسہ یا ناکامی کا خوف لائے بغیر میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مومن ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی روشنی پر عمل پیرا رہتا ہے اور کبھی بھی غیر اقوام ومذاہب کی مادی ترقی اور نمائشی جاہ جلال سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مؤمن
قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اقبالؒ کی آفاقیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ اپنے پیش کردہ تصور مومن کی طرح کسی ایک مقام، مکان اور زمان میں مقید نہیں ہیں۔ وہ ماضی حال اور مستقبل تینوں کو عارفانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ کسی ایک فن، کسی ایک شعبہ، کسی ایک مسلک اور کسی ایک قومیت کے نہیں بلکہ وہ سب کے ہیں۔ بالفاظ اقبالؒ:

مؤمن کے جہاں کی حد نہیں
مؤمن کا مقام ہر کہیں ہے

نیز اقبالؒ کے نزدیک مومن بے اختیار اور مجبور نہیں ہے۔ جبری بے اختیاری انسان کو بے عملی کی طرف لے جاتی جب کہ اختیار واقتدار عمل وجد وجہد کی طرف لے جاتا ہے۔ اقبال جبر واختیار کو بھی خودی کے نظریے کے تحت دیکھتے ہیں۔ جبر کا نظریہ انسان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتا ہے جب کہ اختیار اپنی

کرانے کی خواہش ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور اس محبت کو اقبالؒ اسلام سے متصادم نہیں سمجھتے، البتہ وہ وطن پرستی کے قائل نہیں ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک دین مقدم ہے وطن موخر۔ انسان کی سب سے پیاری چیز اس کی جان عزیز سے بھی دین اسلام مقدم ہے۔ وطن چھوڑا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ جان بھی قربان کی جا سکتی ہے لیکن دین نہیں۔ وہ مسلمانوں کو محبت واخوت کا درس دیتے ہیں۔ جب وطنیت اسلامی اخوت اور اتحاد کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ تو پھر اقبالؒ اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اس وطن پرستی کو مذہب کا کفن قرار دیتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

صفات شاہین

شاہین علامہ اقبالؒ کا سب سے محبوب پرندہ ہے جو دنیاوی آسائشوں، دلبرانہ اداؤں، عاشقانہ نغموں اور پُرتعیش محلوں سے پرہیز کرتا ہے جو اس کو تن آسانی کی طرف مائل کر کے اس کی پرواز میں کوتاہی لاتی ہیں۔ کیونکہ وہ نیلگوں آسمان کی لامتناہی وسعتوں کا دلدادہ ہے اور فطری طور پر راہبانہ زندگی کا عادی ہے۔ اقبالؒ شاہین سے زیادہ اس کی صفات کے زیادہ قائل اور دلدادہ ہیں۔ کیونکہ یہ پرندہ اسلامی فقر کی تمام خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور آپ اس کی غیرت (کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا)، راہبانہ زندگی (اپنا آشیانہ نہیں بناتا)، بلند پروازی (تمام پرندوں میں سب سے اونچی اڑان بھرتا ہے)، تیز نگاہی (انتہائی اونچی اڑان بھرتے ہوئے نیچے اپنے شکار کو صاف اور واضح دیکھ لیتا ہے) کے اوصاف بندہ مؤمن میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اقبالؒ اور تصوف

امام رازیؒ عقل واستدلال اور مولانا رومیؒ باطن کی صفائی کا درس دیتے ہیں۔ اقبالؒ کے بنیادی خیالات اگرچہ اسلامی تصوف خصوصاً مولانا رومیؒ کے تصوف سے ماخوذ ہیں ہیں۔ اقبالؒ مولانا رومیؒ کے ہمنوا ہیں کیوں کہ معرفت کا تعلق عقل سے نہیں دل سے ہے۔ اے خدا تو مجھے ایسی عقل سے بے نیاز کردے جو تیری محبت کے جنوں سے خالی ہو۔ تو مجھے اپنی محبت کا دیوانہ بنادے جیسا کہ تو نے بزرگان سلف کو نوازا تھا:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

لیکن یہ صاحب جنوں ہونا اور اسرار معرفت کی عقدہ کشائی بڑی کٹھن ہے۔ بدقسمتی سے آج ہماری خانقاہوں میں توحید ورسالت، شریعت کے رموز، اسلامی تعلیمات، جہاد، اخوت، عدل وانصاف پر روشنی نہیں ڈالی جاتی اور ہمارے مدارس میں حالانکہ ماضی کے مقابلے میں جدید ٹیکنالوجی اور سہولتیں زیادہ ہیں لیکن یہ علم وعمل میں پستی کا شکار ہیں۔ ظاہری علوم کی ترویج کا تو کسی قدر اہتمام ہے لیکن اصلاح باطن، تزکیہ نفس اور کردار سازی پر الا ماشاء اللہ ذرا توجہ نہیں دی جاتی۔ یعنی کہ رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی۔ حالانکہ ایک وقت تھا یہی خانقاہیں اسرار معرفت وحقائق کا خزانہ تھیں اور انہیں مکتبوں میں افکار عالیہ کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس کا بھی اہتمام تھا۔ وہ خانقاہ اور مدرسہ جہاں دل میں درد، جذبے اور اسلام کی تڑپ پیدا نہ ہو اس درسگاہ اور خانقاہ سے اقبالؒ بیزار ہیں۔ اسی طرح اقبالؒ بے علم صوفیوں اور بے عمل عالموں سے بھی بیزار ہیں:

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

ان سب کے باوجود اقبالؒ ناکامی پر مایوس نہیں ہوتے۔ مایوسی گناہ ہے۔ مایوس ہونا مومن کی شان سے بعید ہے۔ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ۔ (ترجمہ: تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ) وہ اپنی برباد کھیتی سے ناامید نہیں ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اسلاف کے منہج پر عمل کرتے ہوئے اپنے دل کی کھیتی کو ایمان کی چاشنی، توبہ کے آنسوؤں، نماز کے نور، ذکر ودرود شریف کی غذا اور عشق نبی ﷺ کی خوشبوؤں سے مزین کر لیں تو یہ بہت زرخیز زمین ہے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

Abu Abdul Qudddoos Muhammad Yahya
B.Ed. (English, Islamiyat)
Lecturer, Aleemiyah Islamic Degree College,
Karachi. Email : yahyaramzan@gmail.com

ترجمان ''کیسری'' نے لکھا ہے کہ ''نہرو سے اچھا گوڈسے تھا۔اسے گاندھی کونہیں نہروکومارنا چاہیئے تھا''۔

غرض ملک ایک نظریاتی دوراہے پر کھڑا ہے۔اب اسکیم یہ ہے کہ تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر سنگھ کے پسندیدہ افراد بنائے جائیں، تعلیم وتاریخ کے تمام اعلیٰ عہدوں پر سنگھ کے نظریات کو آگے بڑھانے والے آگے آئیں، ہریانہ اورمہاراشٹر کے وزرائے اعلیٰ کی کرسی پر ایسے لوگوں کولانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ایک خبر یہ بھی ہے کہ دستور کی دفعہ 370 ہی نہیں ایک نئے دستور کی بلو پرنٹ بھی تیار ہو چکی ہے۔تا کہ تعلیم کا ''زعفرانی کرن''(Safronization of Education) کا عمل تیزی کے ساتھ شروع کیا جاسکے۔

سارے جہان کی طرح ہندوستان میں بھی امت مسلمہ کواللہ تعالیٰ نے بطور خاص نوازہ ہے۔عالمی سیاسی منظرنامے میں یہ امت کچھ کمزورضرور ہے مگر دینی وفکری اعتبار سے یہ نظریاتی سوپر پاور کی حیثیت رکھتی ہے۔اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الِاسْلَام اور دین متین کے قرآن وسنت کی مستحکم تعلیمات سے آج بھی دشمنان اسلام بدحواس ہیں۔طرح طرح کے پروپیگنڈے اورشعائر اسلام کے خلاف قانونی وسماجی مورچہ بندی کے باوجود اس دین کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔پوری دنیا میں یہ خیرِاُمت دوسری سب سے بڑی آبادی مانی جاتی ہے۔ تقریباً ایک ارب/60 کروڑ کی آبادی جس میں مسلم نوجوانوں کا طبقہ/60 فیصد یا تقریباً/70 کروڑ کی تعداد میں ہے۔اس کے علاوہ کرہ ارضی کا سب سے مردم خیز اور معدنیات سے مالا مال علاقہ اسی قوم مسلم کے تصرف میں ہے۔یوں عددی، مادی، جغرافیائی اور روحانی ہر اعتبار سے اس امت کا پلڑا بھاری ہے، مگر اس وقت پوری امت کے برسراقتدار طبقہ کی اکثریت اسرائیلی وامریکی عیاری کا شکار ہے۔ بالخصوص سعودی عرب، عرب امارات، مصر اور لیبیا وغیرہ۔ع ''حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے''۔ان حکومتوں نے جگہ جگہ زرخرید مولویوں کے ذریعہ اسلامی لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

پچھلی ایک صدی میں عالم اسلام بڑے بڑے انقلابات سے گذرتا رہا۔ برطانیہ جس کی مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور سارے سمندروں پر اس کی حکمرانی تھی۔مثل مشہور تھی کہ Britannia rules the wave مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کالونیل بازوسمٹتے چلے گئے اور مسلم ممالک آزاد ہو گئے پھر یہ محاورہ زبان زد ہوا Britannia had to waive the rule۔ یوں دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں کی غلامی سے مسلم دنیا کو نجات ملی۔57 آزاد مسلم مملکتوں کا ظہور ہوا۔محل وقوع کے اعتبار سے کل زمینی رقبہ کا/23 فیصد مسلم دنیا کے پاس ہے جو معاشی وسائل سے مالا مال ہے اور جس کے پاس پوری دنیا کی توانائی کا 80 فیصد ذخیرہ پایا جاتا ہے، جو علاقہ تمام زمینی، سمندری، ہوائی رابطوں کا مرکز اعصاب مانا جاتا ہے۔کئی ملکوں میں ''بہار عرب'' کا وقتی طور پر رخ تو ضرور موڑا جا چکا ہے مگر مسلم عوام اور قائدوحکمراں طبقہ کے درمیان کشمکش اور دوری بڑھتی جارہی ہے۔امریکہ اور مغربی استعمار کے خلاف نفرت میں ہر روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔پوری مسلم دنیا میں مزاحمت، جدوجہد اور جہاد جوش وخروش سے جاری ہے۔جسے دشمن کی سازشی طاقتیں طرح طرح کی گمرہی اور دہشت گردی کا شکار بنارہی ہیں۔جہاں ایمان عمل کی پہلی بنیاد ہے، جس کی اخلاقی قوت ایمان و عبادت اور معروف ومنکر کے نفاذ سے جلا پاتی ہے اور دعوت وقربانی سے نمود وترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔یہی اسلام کی وہ ایمانی قوت ہے جو کبھی زہر سے بھی تریاق پیدا کر لیتی ہے۔جس کی دو روشن مثالیں سامنے کی ہیں۔اولاً، ملائشیا کی آزادی کے ساتھ ہی برطانیہ، آسٹریلیا اور امریکہ نے وہاں کی نئی نسل کی تعلیم تقریباً اپنے ذمہ لے لیا۔مگر بالآخر انہیں مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اسلامی تنظیم ''ABIM'' قائم کر کے مغرب کے چہرے پر خاک مل دی۔ثانیاً، الجزائر کی نئی مسلم نسل کو فرانسیسیوں کی اخلاق باختگی نے بالآخر ''اسلامی فرنٹ'' کے ذریعہ 1992 میں 90 فیصد ووٹ کا حقدار بنادیا۔اسی طرح فلسطین اور لبنان میں حماس نے بدروحنین کی تاریخ زندہ کردی۔غرض ع ''مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے''، اقبالؒ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہورہی ہے:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

اور

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

لہذا نئی نسل کی اگر ہمیں واقعتاً کردارسازی کرنی ہے تو اس دین متین کے قرآن وسنت کی روشنی میں ہمیں اپنے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی تعمیر نو کرنی ہوگی، جس کے تین فکری پہلو بڑے اہم ہیں:

(ا) حقیقت الحقائق یا حقیقت اصلیہ (Ultimate Reality) اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔(۲) حتمی اور برتر ذریعۂ علم وحیٔ الٰہی ہے اور اس کی صورت قرآن حکیم اور سنت نبوی ہے۔(۳) قدر اعلیٰ (Root Value) رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

ان اصولوں کی وجہ سے اسوۂ نبی کے منہج تعلیم میں نہ ثنویت تھی، نہ طبقاتی کشمکش اور نہ تضادات۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیمی نظام کلی طور پر پیغام عمل تھا۔جہاں ایمان کے بل بوتے پر انسانی سیرت وکردار کی تشکیل ہوتی تھی۔چنانچہ کردار

رشد

نئی نسل کی کردار سازی کیسے؟

پروفیسر احمد سجاد

ہر ملک وقوم اپنی نئی نسل کی کردار سازی کے لیے دو بنیادی امور کو مقدم رکھتی ہے۔ اولاً اس کے معتقدات کو استحکام نصیب ہو، ثانیاً اس کا نظام تعلیم اس کے حال و مستقبل کو معزز و منور کرنے والا ہو۔ مگر ہر نسل کو اپنے عہد کے مختلف چیلنجوں کا ہمیشہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کردار سازی کے کیسے ہی سنہرے اصول وضع کیے جائیں ان کی حیثیت شیخ چلی کے خواب جیسی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی نسل کے سامنے وہ کون سے ایسے چیلنج ہیں جنھیں کردار سازی کے مراحل میں سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ عہد حاضر میں وہ چیلنج ذیل کی شکل میں ابھرے ہوئے ہیں:

(۱) تین سو سالہ مغرب کے الحادی نظام علم وحکمت کا غلبہ (۲) برصغیر کا کافرانہ و مشرکانہ ماحول و معاشرہ اور (۳) اُمتِ مسلمہ کی فکری برتری مگر عملی کوتاہی۔

ان تینوں کی ماہیت پر تھوڑا سا غور کر لیں۔ مغرب نے بحیثیت مجموعی عیسائی مذہب قبول کرنے کے باوجود پچھلے تین سو برسوں میں مسیحی پوپ اور پادریوں کی مذہبی تنگ نظری و تعصب، قول وفعل کے تضاد اور عیاشی و دنیاداری کے ردعمل میں دینی اقدار حیات سے متنفر ہو کر بتدریج مادہ پرستی اور الحاد کی طرف مائل ہو کر نفس علم و تعلیم کو دین و دنیا کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ اب مادیت ہی نہیں صارفیت کا غلبہ ہے۔ روحانی واخلاقی قدروں کا تیزی سے زوال ہو رہا ہے اور آدمی ایک مشین بنتا جا رہا ہے۔ مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناجائز وسائل اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے حلال وحرام کا فرق و امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجتاً مادی ترقی ومعاشی خوشحالی کے باوجود ہر جگہ فحش وبے حیائی، قتل وغارتگری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ خدا، کائنات اور انسان کے درمیان رشتوں کا بحران پیدا ہو چکا ہے اور انسان دوبارہ غار اور جنگلوں کی وحشت ودرندگی سے بھی پرے جا چکا ہے۔ درندگی کا یہ حال ہے کہ بچیوں کو شکم مادر ہی میں قتل کیا جا رہا ہے۔ تلک، جہیز اور معمولی اختلاف پر دلہنوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے۔ بے اولادی کا غم غلط کرنے کے لیے پرایا پیشہ ور عورتوں کی کوکھ کو کرایہ پر لیا جا رہا ہے۔ اور حد تو یہ ہوگئی کہ مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے شادی کر رہی ہے، ملکی قوانین اس کے حق میں منظور کیے جا رہے ہیں۔ اس صورتحال نے تعلیم کا الحادی کرن (Secularization of Education) کر دیا ہے۔

چنانچہ مغربی تہذیب نے ہماری تہذیبی پہچان اور انسانی قدروں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، انٹرنٹ، فیس بک، ٹیوٹر، موبائیل اور ویڈیو کلچر سے ''سادگی اور اعلیٰ خیالی'' (Plain Living and High Thinking) عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ انتشار و خلفشار اور مستقبل سے مایوسی نے نئی نسل کے ایک طبقہ کو خودکشی پر آمادہ کر دیا ہے۔ حالانکہ عصر حاضر میں بھی مولانا آزادؒ اور مہاتما گاندھی جیسی شخصیات نے اپنی سادگی، خلوص وایمانداری اور صداقت وعدم تشدد سے نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی سامراجی قوت کو اکھاڑ پھینکا بلکہ انسانیت کے سامنے اخلاقی قدروں کی بالادستی قائم کر کے دکھا دی۔

اس مغرب زدہ نئی نسل کے استدلالی (Logical) فکر اور توہم پرستی سے بیزاری کے علاوہ اس کا جوش وخروش اور تلاش حق کی جستجو کی بعض خال خال صفات ایسی ہیں جن کی صحیح تعلیم وتربیت سے ایک نئے خوشگوار انقلاب کی شروعات کے امکانات موجود ہیں۔

اس عمومی عالمی صورتحال پر مستزاد اپنے مادر وطن کی تازہ سیاسی وسماجی صورت حال کچھ کم تشویشناک نہیں۔ ویدک دَور کو واپس لانے، ورن آشرم کو دوبارہ لاگو کرنے، تاریخ کو ہندو دیومالائی اور اساطیری روایات کا پابند بنانے کی کوششیں تیز تر ہو چکی ہیں۔ ملک کا وزیر اعظم کہہ رہا ہے کہ گنیش جی پلاسٹک سرجری کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ نہرو اور گاندھی کے نظریے کے برخلاف ویر ساورکر اور ہیڈگوار کے نظریے پر ملک کو لے جانے کی کوشش تیز ہو چکی ہے۔ دستوری ونظریاتی اداروں اور کلیدی عہدوں پر آر، ایس، ایس کے حامیوں کو بٹھایا جا چکا ہے۔ موہن بھاگوت نے گذشتہ 12/ اکتوبر کو راجدھانی دہلی کے پی، ایچ، ڈی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری میں بہت سی اہم شخصیتوں سے ملاقات کی جن میں ایک بھی قابل ذکر مسلمان یا عیسائی نہیں تھا۔ نعرہ کی حد تک ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' تو ضرور کہا جاتا ہے مگر بعض ذمہ دار وزرا، ایم، پی اور سیاسی شخصیات نے اعلانیہ باہمی نفرت، فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینا شروع کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے چھ ماہ میں چھ سو فرقہ وارانہ فسادات (بشمول مظفر نگر فسادات) رونما ہو چکے ہیں۔ کیرالہ آر، ایس، ایس کے ملیالم

سازی کے نقطۂ نظر سے تمام نصابی سرگرمیاں بالعموم درج ذیل اہم مقاصد کے گرد مرتب ہوتی تھیں:

(الف) ایمان، علم دین اور عمل صالح کی تربیت

(ب) دنیا بھر کی قیادت اور اس کے لیے امت واحدہ کی تشکیل اور

(ج) عسکری اور مادی قوت کا حصول

لہٰذا محض نصابی پیوندکاری یا دینیات اور اسلامیات کے محض چند اسباق پر مشتمل کتابوں کی تعلیم کردار سازی کے نقطۂ نظر سے کافی نہیں۔ ہمیں علم کو حقیقت میں خدا کا عطیہ سمجھتے ہوئے یہ ماننا ہوگا کہ علم کے سارے خزانے اس کے پاس ہیں۔ اس تناظر میں کردار ساز اسلامی علوم وہ ہو سکتے ہیں جو حس و تجربہ، مشاہدہ اور قیاس واستدلال کے علاوہ وحی کی برتر روشنی مان کر ترتیب دیے گئے ہوں۔ اس نوع کا آفاقی نصاب تعلیم حیات و کائنات کو مکمل ہم آہنگی بخشتا ہے جو ہر دور میں معیار اعلیٰ کا کام دیتا ہے۔ اس نظام تعلیم کی عمارت کی تعمیر کا زیادہ تر انحصار معلم کی مربیانہ اور داعیانہ شخصیت پر ہے جو کردار سازی اور نتیجہ خیزی کے حوالے سے اصل جوہر ہے۔ استاذ معمار قلب ونظر ہے، جس کا ذاتی تشخص ایمان کی پختگی، صالح عمل، اپنے مضمون پر علمی عبور، موثر حکمت تدریس اور اسلامی مقاصد تعلیم سے گہری وابستگی یہ سب ایسی صفات ہیں جو تدریس اور کردار سازی کے عمل کو موثر اور روحانی تحرک کا باعث بناتی ہیں۔

اس تناظر میں مسلم ملکوں میں اسلامی ریاست اور اقلیتی ملکوں میں مسلم تعلیمی اداروں، رضا کار تنظیموں (NGOs) مسلم یونیورسٹیوں، بڑے مدارس اسلامیہ اور دارالعلوموں کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اساتذہ کی نظریاتی، علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کا پورا نصاب بتدریج ابتدا سے انتہا تک، اسلامی اساسیات کی روشنی میں مرتب کریں، بالخصوص تعلیم و تعلم کی تمام سرگرمیوں کو اس محوری نکتہ کے گرد تشکیل دیں کہ دائمی اور برتر نوعیت کا ذریعہ علم وحئ الٰہی ہے اور باقی تمام حسی، تجربی اور قیاسی علوم اس بالاتر چشمۂ علم کے تابع ہیں۔ غرض تعلیم کی ہر سطح اور ہر مضمون میں مقاصد تعلیم کے تعین، نصابات کی تشکیل، اساتذہ کے لیکچرز اور ان کے افکار و اعمال، غرض پورے تعلیمی اور تربیتی پروگرام میں اسلامی اقدار کے فروغ کو مرکزی حیثیت دینے کی ضرورت ہے ورنہ نظام تعلیم اسلامی تشخص اور نئی نسل کی کردار سازی سے یقینا محروم رہ جائے گا۔ موجودہ اسلامی نصاب میں کردار سازی کے نقطۂ نظر سے ممکنہ تبدیلیوں کے لیے مندرجہ ذیل نکات قابل لحاظ ہیں:-

☆ مدارس اسلامیہ میں مروجہ قدیم منطق و فلسفہ کی جگہ فلسفۂ جدید، نفسیات اور معاشیات کو لانا چاہیے۔

☆ مناظرہ کی جگہ تقابلی مذاہب کا نظم ہو کیونکہ آج تہذیبی مذاکرات، مفاہمت، بین المذاہب مجالس اور عالمی اخلاقیات کا دور دورہ ہے۔

☆ قدیم علم کلام کی کتابوں کی جگہ جدید علم کلام مرتب ہوتا کہ مغربی ذہن کے شکوک وشبہات واعتراضات وسوالات کے جواب دیے جا سکیں۔

☆ چاروں فقہ بے شک حق پر ہیں مگر ان میں تقابلی فقہ بھی پڑھائی جائے تا کہ مسلکی جدال پر قابو پایا جا سکے۔

☆ تدریس کے ساتھ تحقیق و تنقید کا شعور بیدار کیا جائے۔

☆ ہزاروں مدارس اسلامیہ میں لاکھوں اساتذہ کارکردہیں مگر ان کی تدریسی تربیت کا کوئی خاص نظم نہیں۔ بی ایڈ کے کورس کو اردو کا جامہ پہنا کر اسلامی علوم کی رعایت سے تدوین شدہ نصابیات کی تعلیم کا نظم قائم کیا جائے۔ تدریب المعلمین کا موجودہ کورس کافی نہیں۔

☆ بطور تخصص انگریزی، ہندی اور کمپیوٹر انٹرنٹ میں مہارت پر توجہ آج کی اہم ضرورت ہے۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام دین اور دنیا کا جامع ہے۔ بقول اقبالؒ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کل تک ان ہی مدارس کے فارغین کی کتابیں صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ یورپ کے پہلے دو میڈیکل کالج سالیرنو اور ماؤنٹ پیلیر میں قائم ہوئے۔ ان کے نصاب میں بالخصوص ذکریا الرازی کی الحاوی، ابن سینا کی القانون اور ابوالقاسم الزہراوی کی التصریف کے لاطینی ترجمے صدیوں تک پڑھائے جاتے رہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "بعد کو ریاضی، طب، ہیئت اور جغرافیہ کا دائرہ سکڑ گیا تو علما کی امامت کا دائرہ آفاق سے گھٹ کے مسجد تک محدود ہو گیا"۔

یہ صحیح ہے کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں جو بھی تبدیلی ہو باہر سے تھوپی ہوئی نہ ہو بلکہ ان کی اپنی مرضی سے سوچی سمجھی ہو۔

اگر ایسا نصاب اور ایسے معلمین تیار کیے جا سکے تو پھر ان کے ہاتھوں طلبا کی جو کردار سازی ہوگی ان میں درج ذیل اوصاف یقینا پیدا ہو سکیں گے:-

(۱) اسلام اور اس کی تہذیب پر فخر اور اسے دنیا میں غالب کرنے کا عزم (۲) اسلامی اخلاق سے انصاف اور اسلامی احکام کی پابندی (۳) دین میں تفقہ اور مجتہدانہ بصیرت (۴) تنگ نظر فرقہ بندی سے پاک (۵) تحریر و تقریر اور بحث کی عمدہ صلاحیتیں اور تبلیغ دین کے لیے مناسب قابلیتیں (۶) جفاکشی، محنت، چستی اور اپنے ہاتھ سے ہر طرح کے کام کر لینے کی صلاحیت (۷) تنظیم و انتظام اور قیادت کی صلاحیتیں۔ ایسے ہی باکردار طلبا عقابی روح کے حامل ہوں گے۔

Prof AHEMD SAJJAD
MA (Double) D. Litt.
Former Dean Deptt of Humanities
Ranchi University, Ranchi
Contact : 9431359971

وطن

للّن اور کلّن

ڈاکٹر سلیم خان

پوسد ٹائمز کے مدیر للن خان ایکزٹ پول کے سامنے سر پکڑ کر بیٹھے تھے کہ رپورٹر کلن ان کے کمرے میں داخل ہوکر بولا صاحب آپ دفتر میں اداس بیٹھے ہیں اور باہر جشن منایا جارہا ہے۔

للن نے حیرت سے کہا ابھی سے جشن؟ ارے بھائی پولس کو فون کرو کہیں فساد نہ ہوجائے۔

کیوں! اس میں فساد کی کیا بات ہے؟

ارے بھائی سیاسی جشن میں اشتعال انگیز نعروں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟ پھر اس کا ردعمل سامنے آئے تو فساد ہوجاتا ہے۔

جی نہیں جناب یہ غیر سیاسی جشن ہندو مسلمان مل کر منا رہے ہیں۔

اچھا؟ للن نے پھر سوال کیا وہ کیوں؟

وہ اپنے محلے کے امام صاحب حافظ مجیب الرحمٰن کو اکولہ کی خصوصی عدالت نے باعزت بری کردیا ہے۔

وہی نا جنہیں 2015 میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر چاقو زنی کی واردات کے بعد اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ (ATS) نے گرفتار کرلیا تھا۔

جی ہاں اور ان کے ساتھ گرفتار ہونے والے بےقصور نوجوان شعیب خان کو بھی رہائی نصیب ہوئی۔ اللہ نے رمضان میں دو دونوں کی دادرسی فرمائی۔

للن نے کہا ''مجھے تو پہلے دن سے یقین تھا کہ مولانا مجیب الرحمٰن پر اشتعال انگیز تقریر کرنے اور تشدد میں ملوث ہونے کا الزام بے بنیاد ہے۔''

کلن بولا ''ارے صاحب شعیب خان تو میرا اہم جماعت تھا۔ وہ کبھی بھی اس طرح کی کارروائی میں ملوث نہیں ہوسکتا مگر بلاوجہ اس کو پھنسادیا گیا۔''

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟'' للن نے پوچھا۔

''اے پی سی آر کے ایڈوکیٹ علی رضا خان نے نہایت منظم انداز میں بے باکی کے ساتھ پیروی کرتے ہوئے سارے الزامات کو غلط ثابت کردیا۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے میری رائے تو یہ ہے کہ اب اے پی سی آر کو ان افسران پر پنجہ کسنا چاہیے کہ جنھوں یہ جھوٹے الزامات لگائے تھے۔''

''جی ہاں اس کے بغیر ایسی وارادات پر لگام نہیں لگے گی لیکن یہ کیا؟ ساری قوم ایکزٹ پول میں کھوئی ہوئی ہے اور آپ ملیشیا کی خبر دیکھ رہے ہیں؟''

''جی ہاں کلن اس ہیجان میں ایک اہم خبر سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔''

کلن نے چونک کر پوچھا ''او ہو کون سی خبر؟''

''وہی رافیل لڑا کا جہازوں کے اچانک اترنے پر مجبور ہونے کا سماچار۔''

''او ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے صاحب کہ رافیل کا جہاز اترے تو اس کا سواگت کرنے کے لیے پردھان سیوک نہ جائیں اور میڈیا پیچھے رہ جائے!''

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن رافیل کے وہ جہاز احمد آباد میں تھوڑی نا اترے کہ مودی جی اس کا سواگت کریں۔ ان کو تو ملیشیا میں اترنا پڑ گیا۔''

''ملیشیا میں؟ ارے وہ وہاں کیسے پہنچ گئے؟ ڈیسالٹ نے غلط پتہ پر بھیج دیا تھا کیا؟ یہ تو غلط بات ہے کہ بدنامی اٹھا کر خصوصی قیمت پر جہاز ہم خریدیں اور انہیں کہیں اور پہنچادیا جائے۔ یہ تو بہت بڑی ناانصافی ہے۔''

''ارے بھائی کلن، ملیشیا والے ایسے بیوقوف تھوڑی ناہیں جو اتنا مہنگا جہاز خریدلیں۔''

''تو کیا آپ اپنے پردھان سیوک کو کم سمجھتے ہیں۔ وہ تو انل امبانی کے ڈوبتے جہاز کو سنبھالنے کی خاطر انہوں نے یہ سودہ کرلیا

لیکن انل تو پھر بھی دیوالیہ ہوگیا۔''

کلن بولا ''اب مودی جی کوشش ہی تو کرسکتے ہیں۔ کسی کی قسمت کیسے بدل سکتے ہیں؟''

''جی ہاں مجھے بھی اندازہ ہے کہ کسی گجراتی سے بہتر مول بھاؤ کوئی اور نہیں کرسکتا ہے!''

کلن نے سوال کیا''ملیشیا نے اگر جہاز خریدے ہی نہیں تو کیا رافیل کے جہاز وہاں کسی سرجیکل اسٹرائیک کے لیے گئے تھے؟''

''ایسی بات نہیں۔ وہ تو اپنے بحری بیڑے میں مشق کر رہے تھے۔''

''تو کیا کوئی قزاق انہیں اغواء کر کے ملیشیا لے گیا؟''

''جی نہیں بادل، بارش میرا مطلب ہے موسم کی خرابی کے سبب ان کو اترنے پر مجبور ہونا پڑا۔''

''ارے یہ کیسا جہاز خرید لیا اپنے پردھان سیوک نے جو بادل بارش کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا؟ لیکن ملیشیا نے اپنے علاقہ میں پرواز پر اعتراض نہیں کیا؟''

''نہیں کیا کیونکہ نیول کمانڈر عارف نے راڈار کی مدد سے دیکھ کر پتہ لگا لیا کہ وہ جہاز ملیشیائی سمندری حدود سے 100 میل دور مشق کر رہے تھے۔''

''لیکن مودی جی تو کہتے ہیں کہ بادلوں کو چیر کر رڈار کی آنکھ جہاز کو نہیں دیکھ سکتی پھر ان لوگوں نے کیسے دیکھ لیا؟''

''ارے بھائی پاکستان کے رڈار بادلوں میں ہندوستانی جہاز کو نہیں دیکھ سکتے۔ اب نہ تو وہ جہاز ہندوستانی ہے اور نہ رڈار پاکستانی! کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا لیکن پھر کیا ہوا؟''

''ملیشیا والوں نے اسکندر مدا ائیر بیس پر اتارنے کے بعد فوجیوں کی تلاشی لی۔ چونکہ ان میں سے کوئی ہتھیار سے لیس نہیں تھا اس لیے اجازت دے دی۔''

''ارے وہ تو بڑے بیوقوف نکلے۔ اتنا کچھ ہو گیا اور کوئی سیاست نہیں کی؟''

''ارے بھائی جب حکومت اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو سیاسی تماشے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں یہ معاملہ ہی نہیں ہے۔''

''تو کیا فرانسیسی حکومت نے اس حسن سلوک کے عوض ملیشیا کو ایک آدھ جہاز تحفہ میں دے دیا؟''

''جی نہیں اس تنگ دل قوم سے یہ توقع کرنا عبث ہے۔ جب موسم ٹھیک ہوا تو سات میں پانچ جہاز لوٹ گئے۔''

''اور دو کیوں نہیں لوٹے؟''

''اس لیے کہ ان کو مرمت کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔''

''بھئی کمال ہے یہ تو بڑا نازک مزاج طیارہ نکلا۔ ذرا سا بھیگنے پر زکام ہو گیا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سوچو اگر ہمارا رافیل موسم کی خرابی کے سبب غلطی سے پاکستان کے حدود میں داخل ہو جائے تو کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں وہ پاکستانی رڈار کو نظر ہی نہیں آئے گا۔''

''ایسے میں وہ ایمرجنسی لینڈنگ کی اجازت کیسے لے گا؟ اس لیے کہیں جل سمادھی اس کا مقدر نہ بن جائے؟''

''جی نہیں، کلن انتخاب کے بعد دوبارہ ہند پاک تعلقات سدھر جائیں گے اور وہ ابھی نندن کی مانند بلا اجازت اترنے کے باوجود لوٹا دیئے جائیں گے۔''

کلن نے سینہ پھلا کر کہا''اور ہمارے پردھان سیوک مودی سے پاکستان ڈرتا بھی تو ہے؟''

للن نے مسکرا کر پوچھا''اگر ایسا ہے تو ڈرا دھمکا کر کلبھوشن جادھو کو چھڑا کیوں نہیں لیا جاتا؟''

کلن لاجواب ہو گیا۔ بولا''صاحب! رافیل کی اڑان سے نکل کر باہر آئیں اور یہ پوسد کے جشن کی تصاویر دیکھیں۔''

''جی ہاں کلن، کل اپنے اخبار کی شہ سرخی یہی ہوگی اور یہ تصویریں صفحہ اول کی زینت بنیں گی۔''

''ٹھیک ہے سر۔ میں خبر بناتا ہوں۔''

للن نے کہا''اور ہاں یہ لو اے پی سی آر مہاراشٹر کے صدر اسلم غازی کا نمبر۔ ان سے رابطہ کر کے تاثرات ضرور شامل کرنا۔''

''سر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟''

''وہ بہت بھلے آدمی ہیں۔ پوسد میں ان کا آنا جانا رہا ہے۔ اب جلدی سے خبر بنا کر مجھے دکھاؤ۔ کیا سمجھے؟''

سوڈان کا عوامی انقلاب

ڈاکٹر سلیم خان

مراقش اور مصر کے بعد عوامی مزاحمت نے سوڈان کے اندر ایک سیاسی انقلاب برپا کر دیا۔ عوامی مظاہرے تو دنیا بھر میں ہوتے ہیں مثلاً امریکہ کے اندر وال اسٹریٹ پر ہونے والا زبردست احتجاج یا ہندوستان کے اندر چلنے والی انا ہزارے کی غیر معمولی تحریک لیکن اس کے نتیجے میں اقتدار پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عوام کچھ دن چیختے چلاتے ہیں اور پھر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کانگریس کے خلاف انا ہزارے کے شانہ بشانہ تحریک چلانے والے اروند کیجریوال اقتدار میں آنے کے باوجود لوک پال کا تقرر نہیں کرتے۔ انا ہزارے کی حمایت کرنے والا سنگھ پریوار اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن صرف مسلم دنیا کا امتیاز ہے کہ وہاں عوامی مزاحمتیں بارآور ہوتی ہیں۔ اسلامی ممالک کے لوگ سڑکوں پر اتر کر احتجاج کرتے ہیں تو حسنی مبارک اور عمر البشیر جیسے حکمرانوں کو چلتا کر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سوڈان کے لوگ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کسی جذباتی مسئلہ یا خیالی دشمن کے خلاف نہیں بلکہ مہنگائی اور معیشت کی بہتری کے بنیادی مسائل کو اٹھا کر 30 سالہ اقتدار کو اکھاڑ پھینکا۔

سوڈان کے حالیہ احتجاج 19 دسمبر 2018 سے شروع ہوا۔ اشیائے خورو نوش کی قیمتوں میں اضافہ اور بگڑتی ہوئی معیشت کے خلاف مظاہرے پچھلے چار ماہ سے بغیر رکے جاری رہے اور سابق صدر عمر البشیر کے 30 سالہ اقتدار کے لیے طاقتور چیلنج بن گئے۔ ان سے گھبرا کر عمر البشیر نے مرکزی حکومت کو برطرف کر دیا اور ریاستوں کے گورنروں کو ہٹا کر ان کی جگہ سکیورٹی عہدیداران کا تقرر کیا۔ جیسا کہ جموں اور کشمیر میں کیا گیا تھا۔ اندرا گاندھی کی طرح ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ عام لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں اور ان کے ذریعہ بلا اجازت عوامی اجتماع پر روک لگائی گئی۔ پولیس کے اختیارات میں توسیع کی تا کہ بغاوت کو کچلا جا سکے۔ لیکن یوگی کی مانند انکاونٹر کی کھلی چھوٹ

نہیں دی۔ان اقدامات سے عوام خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ ان کے غم وغصہ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ان کا جوش اور ولولہ سرد ہونے کے بجائے بڑھنے لگا۔آگے چل کر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو خواتین بھی میدانِ عمل میں آگئیں۔اس کے نتیجے میں عمرالبشیر کے ارادے پسپا ہوگئے اور پچھلے ماہ یوم خواتین کے موقع پر انہوں نے حراست میں لی جانے والی ساری خواتین کی رہائی کا حکم دے دیا، لیکن لوگ نہیں مانے یہاں تک کہ انہیں استعفیٰ دے کر رخصت ہونا پڑا۔

سوڈان کو ہندوستان کے نو سال بعد برطانوی سامراج سے آزادی ملی۔اس کے دو سال بعد 1958 میں چیف آف سٹاف میجر جنرل ابراہیم آبود نے ایک خونیں بغاوت کے بعد اقتدار پر قبضہ کرلیا۔لیکن وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہیں کرسکے۔1964 میں ایک عوامی بغاوت نے فوج کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کردیا۔یہ تجربہ دیر پا نہیں قائم نہیں رہ سکا پانچ سال بعد 1969 میں کرنل جعفر نمیری کی سربراہی میں ایک اور بغاوت کے بعد اقتدار پر پھر سے فوج قابض ہوگئی۔1985 کے اندر بالکل اسی طرح کی صورتحال میں جنرل عبد الرحمان سوارالدحاب کی سربراہی میں نمیری کو اقتدار سے بے دخل کردیا گیا۔جنرل الدحاب نے ایک سال کے اندر انتخابات کروا کر تمام اختیارات عوام کے نمائندوں کو سونپ دیئے۔اس طرح نہایت پرامن طریقہ سے صادق المہدی کے ہاتھوں میں ملک کا اقتدار آگیا۔

سوڈان کی باگ ڈور فی الحال جنرل عبدالفتح البرہان کے ہاتھوں میں ہے۔ان کو عسکری عبوری کونسل کا صدر منتخب کیا گیا ہے امید ہے۔وہ بھی جنرل عبدالرحمٰن الدحاب کی طرح ملک کا اقتدار جلد ہی عوامی نمائندوں کے حوالے کردیں گے۔عبوری فوجی کونسل کی سیاسی کمیٹی کے سربراہ عمرزین العابدین نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ ''ملکی بحران کا حل فوج نہیں، بلکہ عوام تجویز کریں گے۔'' انہوں نے اخبار نویسوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم عوامی مطالبات کے محافظ ہیں اور تمام سیاسی جماعتوں نے اتفاق رائے سے یہ ذمہ داری ہمارے سپرد کی ہے۔'' ان کے اس بیان سے عوام جھوم اٹھے کہ ''ہم یعنی فوج اقتدار کی حریص نہیں ہے۔'' زین العابدین کا یہ بیان بھی خوش آئند ہے کہ ''عبوری فوجی کونسل کے پاس سوڈان کو درپیش بحرانی کیفیت کا حل نہیں ہے بلکہ موجودہ صورتحال سے نکلنے کی راہ مظاہرین ہی سجھائیں گے۔عبوری کونسل موجودہ بحران کو ختم کرنے کے لئے مذاکرات کا خیر مقدم کرتی ہے۔ہم لوگوں پر اپنی طرف سے کچھ مسلط کرنے کے بجائے مذاکرات کے لئے سازگار فضا تیار کریں گے۔''

سوڈان کے فوجی سربراہ جس طرح کی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کررہے ہیں ایسی پختگی اور سنجیدگی تو دیگر ملک کے سیاستدانوں میں بھی ناپید ہے۔زین العابدین نے توقع ظاہر کی کہ ''اقتدار کی منتقلی کا کام زیادہ سے زیادہ دو برسوں میں مکمل ہوجائے گا، تاہم اگر یہ بغیر افراتفری کے ہوجائے، تو اس کے لئے ایک ماہ کی مدت بھی کافی ہے۔'' حکومت کی اس بڑی تبدیلی کے باوجود سوڈان کے اندر جو خوشگوار ماحول ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ عمرالبشیر کو اقتدار سے محروم کردینے کے باوجود ان کی سیاسی جماعت نیشنل کانگریس پارٹی کو آئندہ انتخاب میں شرکت کی اجازت دی گئی ہے۔30 سال قبل صادق المہدی کی غیر مستحکم حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد عمرالبشیر نے یہ سیاسی پارٹی بنائی اور تین مرتبہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے 30 سال حکومت کی لیکن عوام کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہوئے تو انہیں باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔سوڈان کے اندر ایسا نہیں ہوا کہ ہر محاذ پر زبردست ناکامی کے باوجود قوم پرستی اور فرقہ

اس تصادم میں جب کہ فوجی اہلکار مظاہرین کی حفاظت کررہے تھے 11 لوگوں کی ہلاکت ہوئی جن میں 6 فوجی اہلکار بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود راجدھانی خرطوم میں ہزاروں مظاہرین جوق در جوق جمع ہوتے رہے۔ اس دوران یہ خوشخبری آئی کہ عمر البشیر اپنے منصب سے سبکدوش ہوگئے ہیں اور ان کے قریبی سمجھے جانے والے 100 سے زیادہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔

پرستی کے سہارے پھر سے اقتدار پر فائز ہونے کی کوشش کی گئی۔

سوڈان کا احتجاج اس وقت بامِ عروج پر پہنچ گیا جب ہزاروں مظاہرین نے خرطوم میں وزارت دفاع کے دفتر اور عمر البشیر کی رہائش گاہ کے باہر ڈیرے ڈال دیے۔ ان کو منتشر کرنے کے لیے حفاظتی دستے سامنے آئے تو فوج نے ان کو روک دیا۔ اس تصادم میں جب کہ فوجی اہلکار مظاہرین کی حفاظت کررہے تھے 11 لوگوں کی ہلاکت ہوئی جن میں 6 فوجی اہلکار بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود راجدھانی خرطوم میں ہزاروں مظاہرین جوق در جوق جمع ہوتے رہے۔ اسی دوران یہ خوشخبری آئی کہ عمر البشیر اپنے منصب سے سبکدوش ہوگئے ہیں اور ان کے قریبی سمجھے جانے والے 100 سے زیادہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ خرطوم کے ہوائی اڈے کو پروازوں کے لیے بند کردیا گیا ہے تاکہ ان میں سے کوئی نیرو مودی اور وجے ملیا کی طرح ملک کی دولت لوٹ کر فرار نہ ہونے پائے۔

عمر البشیر کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا کام عبوری فوجی کونسل کے سربراہ اور وزیر دفاع محمد احمد عوض بن عوف نے اس اعلان کے ساتھ کیا کہ ”دو برس تک ملکی امور فوج کی نگرانی میں عبوری سیاسی سیٹ اپ چلایا جائے گا، جس کے بعد قومی انتخابات منعقد کرائے جائیں گے۔“ عمر البشیر کو ہٹانے کے بعد سابق وزیر دفاع عوض بن عوف نے ملک میں تین ماہ کے لیے ایمرجنسی نافذ کرتے ہوئے ملک کے آئین کو عارضی طور پر معطل کردیا۔ عوض بن عوف چوں کہ عرصہ دراز سے عمر البشیر کے دست راست تھے اس لیے مظاہرین مطمئن نہیں ہوئے اور احتجاج جاری رہا۔ چنانچہ اپنی کرسی سے چپکنے کے بجائے انہوں نے بھی ایک دن کے اندر استعفیٰ دے کر جنرل عبدالفتح البرہان کو عبوری کونسل کا صدر بنادیا۔ اس پر عوام نے خوشی کا اظہار کیا۔ جنرل عبدالفتاح البرہان نے اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے کرفیو منسوخ کرکے ہنگامی حالت کے قانون کے تحت گرفتار شدہ تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔

سابق صدر عمر البشیر پر امریکہ نے 1993 میں اسلامی عسکریت پسندوں کو پناہ دینے کا الزام لگا کر دہشت گردی کی امداد کرنے والے ممالک کی فہرست میں شامل کردیا تھا۔ چار سال بعد واشنگٹن نے سوڈان پر پابندیوں کا اعلان کرکے اسے تنہا کرنے کی کوشش کی اور 2003 کے اندر جرائم کی عالمی عدالت میں عمر البشیر پر سوڈان کے دارفور علاقہ کی بغاوت میں نسل کشی کے الزامات بھی عائد کرکے مجرم قرار دے کر حراست میں لینے کا وارنٹ جاری کردیا۔ عمر البشیر کے دور میں دارفور کے معاملے کا چرچا تو مغرب خوب کرتا ہے لیکن جنوبی سوڈان کی پرامن علٰحیدگی کی بات کوئی نہیں کرتا۔ جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کی اکثریت ہے اور وہاں تیل کے کنوئیں ہیں۔ وہ علاقہ ہمیشہ سے انتشار کا شکار رہا اور قتل و غارت گری جاری رہی۔ مغرب اس تشدد کو ہوا دیتا رہا یہاں تک شمالی سوڈان کی عمر البشیر حکومت نے جنوبی سوڈان کو زور زبردستی سے اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے الگ کردیا۔ علٰحیدہ حکومت قائم ہوجانے کے بعد بھی جنوبی سوڈان میں قتل و غارت گری کا ننگا ناچ بند نہیں ہوا۔

ابھی حال میں سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو خوب چل رہی تھی جس میں عیسائی مذہبی پیشوا پوپ جنوبی سوڈان کے رہنماؤں کی قدم بوسی کرکے ان کو امن و امان کے ساتھ رہنے کی درخواست کررہے ہیں۔ امن اس طرح قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے عدل قائم کرنا پڑتا ہے اور ضرورت پڑنے پر عوامی تحریک چلا کر نااہل حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنا پڑتا ہے جیسا کہ سوڈان کے اندر ہوا ہے۔ سوڈان کے شمال اور جنوب کے درمیان کا یہ فرق اسلامی تہذیب و ثقافت کے سبب ہے کہ جس نے شمال کے مسلمانوں کو عدل و انصاف کے لیے ایثار و قربانی دینے والی جری قوم بنادیا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ اس بات کی توقع کررہا تھا کہ مغرب کی خوشنودی کے لیے نئے سربراہ عمر البشیر کو دشمنوں کے حوالے کرنے پر تیار ہوجائیں گے۔ لیکن عبوری فوجی کونسل کی سیاسی کمیٹی کے سربراہ نے معزول صدر کی کسی دوسرے ملک حوالگی کے امکان کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ان پر زیادہ سے زیادہ سوڈان ہی میں مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ اسے اختلاف اور رقابت کا فرق کہتے ہیں بقول اقبال علیہ الرحمہ:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

DR SALEEM KHAN
Vice President
Idara-e-Adab-e-Islami Hind,
Author & Political Analyst, Mumbai
Email:drsalimkhan@gmail.com

تلمیذ فاطمہ نقوی

معیاری زندگی کے لئے معیاری تعلیم شرط لازم ہے۔ یہ شرط فرد کے لیے بھی لازمی ہے اور سماج کے لئے بھی۔ تعلیم کا معیار تو نصاب تعلیم سے متعین ہوتا ہے البتہ طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت سازی میں بہت ہی ذمہ دارانہ (crucial) کردار ایک اچھے معلم اور استاد کا ہو تا ہے۔ معلم کا کام محض طلباء کو چند حقائق سے آگاہ کر دینا اور بعض معلومات منتقل کر دینا نہیں ہے۔ اس کا فرض طلبہ کی شخصیت کی تعمیر کرنا، ان کی رنگارنگ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا، ان کے اندر دانش وحکمت پیدا کرنا اور انہیں سماج کا ایک متحرک اور مفید رکن بنانا ہے۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ معلم طلبہ اور سماجی تقاضوں کے درمیان ایک فکری اور نظریاتی پُل قائم کرے تاکہ بدلتی ہوئی دنیا میں طلباء ان صلاحیتوں سے لیس رہیں کہ جو ایک جدوجہد سے بھرپور زندگی کی ضامن ہوں۔

تبدیلی اس دور کی سب بڑی حقیقت ہے۔ اس دور کی تبدیلیوں نے تعلیم اور نظام تعلیم پر بھی بھرپور اثر ڈالا ہے۔ موجودہ دور تغیر اور تبدیلی کے لحاظ سے انتہائی سریع اور تیز رفتار دور واقع ہوا ہے۔ عالمگیریت (گلوبلائزیشن) نے خود کفالت کی فکر کو پچھاڑ دیا ہے۔ بین ممالک کمپنیوں (MNC's) نے پورے عالم کو ایک بازار میں تبدیل کر دیا ہے۔ تہذیب وثقافت کے میدان میں اجتماعیت نے انفرادیت پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ آج انفرادی تشخص اور اجتماعی روش کے مابین توازن قایم کرنے کی ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ علم میں فروغ کی رفتار اتنی شدید ہے کہ حصول علم کے طریقوں میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر علم، متعلم اور معلم کے درمیان ربط قایم رکھنا مشکل کام بن چکا ہے۔ آج کے زمانے میں علم حاصل کرنے سے کہیں زیادہ اکتساب کے طریقوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ علم اور عمل کے درمیان ہر خلیج کو پُر کرنا استاد کے بنیادی فرائض میں شامل ہو گیا ہے۔ بدلتی دنیا میں قومی ورثہ اور اقدار کی حفاظت نئی تعلیمی ضرورت بن گئی ہے۔ اس دور کے استاد کو نہ صرف کلاسیکی استاد کا کردار ادا کرنا ہے بلکہ بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کے پیش نظر جدت طرازی کے سلسلوں کو بھی اپنے لائحہ عمل میں شامل کرنا ہے۔

جمہوری مزاج کی تشکیل اور جمہوری طرز حیات کی تربیت کے لئے معلم کو مسلسل روبہ عمل رہنا جمہوری ملک کی ضرورت ہے۔ تنقید واختلاف کے باوجود ہم آہنگی اور ربط کا قیام معلم کے لئے دشوار کن ہونے کے باوجود وہ لازمی فریضہ
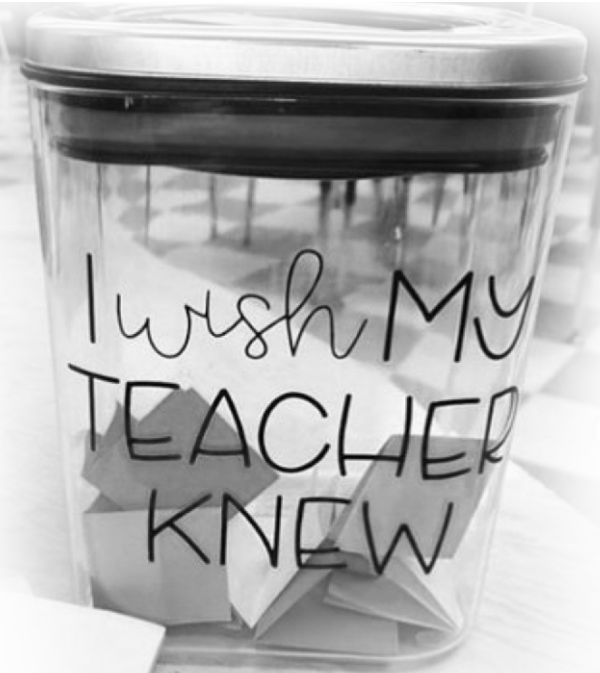
ہے جس سے چشم پوشی تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں تنوع اور اختلافات کی بہتات تو ہے مگر رواداری کے عناصر بھی قابل قدر حد تک موجود ہیں۔ رواداری اور ہم آہنگی کے جذبات موجود ہونے کے باعث ہی ہندوستان کی شناخت تہذیبوں کے گلشن کے حوالے سے ہے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ طلباء کو اس خصوصیت سے آگاہ کرائے۔

تعلیم کے میدان میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے کے باعث معلم کی ذمہ داریاں بھی وسیع اور عمیق تر ہوگئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے نتیجہ میں سماج کے محروم طبقوں کے بچے بھی درسگاہوں تک پہونچنے لگے ہیں۔ نہ

معلم کو ایک ساتھ کئی کردار ادا کرنے ہیں۔ اس کا ایک کردار رہنما کا بھی ہے۔ موجودہ دور میں معلم سے مراد صرف اطلاعات پہونچانے والا آلہ نہیں ہے کیونکہ آج کے تکنیکی دور میں تمام اطلاعات ایک انگشت کی معمولی حرکت سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔

صرف یہ کہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بلکہ بہت سے خاندانوں کی پہلی نسل تعلیم حاصل کرنے کے لئے سامنے آئی ہے۔ پہلی نسل کی دقتیں، ضرورتیں، مزاج، مسائل اور خواہشات مختلف ہیں۔ اس لیے یہ نسل اساتذہ کے لئے ایک چیلنج بن کر آئی سامنے آئی ہے۔ افلاس اور غربت کے شکار طلبہ کے اس طبقے کو درس وتدریس میں متحرک بنانا ایک ایسا دشوار کن مسئلہ ہے جس کے لئے مختلف طریقہ تدریس کی ضرورت ہے۔ خود اساتذہ کی تربیت کی ضرورت ہے۔ مختلف ثقافتی اور معاشی پس منظر سے آنے والے ان بچوں کو دوسرے ماحول سے تعلق رکھنے والے بچوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ایک بڑا کام ہے، جس کے لئے اساتذہ کی طرف سے نفسیاتی طریقہ تدریس اپنایا جانا لازمی ہے۔

علم کا دائرہ اور معلومات کے خزانے میں متواتر اضافے کے پیش نظر معلم کی ذمہ داری کی نوعیت میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اب معلم محض معلومات فراہم کرنے کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ طلبہ کو حصول علم کے نت نئے طریقوں سے واقف کرانا تاکہ طلبہ از خود معلومات تک رسائی حاصل کرسکیں، معلم کے فرائض میں شامل ہوچکا ہے۔ اس عہد کے معلم کو طلبہ کو یہ سکھانا ہے کہ کسی معاون اور مددگار کے بغیر ایک طالب علم معلومات کیسے حاصل کرتا ہے تاکہ علم حاصل کرنے کا دروازہ طالب علم کی تمام عمر کے لیے کھل جائے۔

موجودہ دور ایسے معلمین کا تقاضہ کرتا ہے جو تحقیقی مزاج رکھتے ہوں۔ جو اپنے اہداف اور طریقہ کار پر خود سوالیہ نشان لگانے کی ہمت رکھتے ہوں اور خود ہی ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ معلم کا کام کتابوں میں لکھے اصولوں کی ہو بہو تقلید کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کو ماحول اور طلبا کے مزاج کے پیش نظر خود اپنے اصول مرتب کرنے چاہئیں۔ اس کے لیے انہیں معلم کے رول کے ساتھ ساتھ ایک محقق کا رول کا بھی ادا کرنا ہوگا۔ بلکہ ایک حقیقی محقق ہی ایک حقیقی معلم ہوسکتا ہے۔ معلم کو ایسے مواقع تلاش کرنے ہوں گے جس کے ذریعہ وہ اپنی عملی تحقیقی مہارت کی نشونما کرسکے۔

تعلیم کے چار اہم ستون ہیں جو کہ یونیسکو کے ڈیلولار کمیٹی نے تجویز کیے ہیں۔ اکتساب برائے علم، اکتساب برائے عمل، اجتماعی طور پر زندگی گزارنے کے لیے اکتساب اور تشخیص کے لیے اکتساب۔ اس پر عمل کرنے کے لیے درکار ہنر وقت کی ضرورت ہے۔ یعنی تدریس کا مطلب ومقصد صرف اطلاعات کا ذہن میں محفوظ کردینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاعمر چلنے والا سلسلہ ہے اس کو مختلف قسم کے تجربات کے ذریعے کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ اکتساب برائے علم سے مراد طلباء میں قوت متخیلہ، منطق، استدلال اور تجرباتی انداز سے سوچنے کی اہلیت پیدا کرنا ہے۔ تعلیمی تجربات کو اس طرح پیش کرنا چاہئے جس سے طلباء میں یہ تمام اہلیتیں پیدا ہوسکیں۔ اکتساب برائے عمل سے مراد جو کچھ طلباء کو تعلیمی تجربات کے ذریعہ علم دیا گیا ہے اس کا مناسب طریقہ سے اطلاق کرنے کا ہنر طلباء میں پیدا کرنا ہے۔ یعنی اب تعلیم، مہارت سے استعداد کی طرف منتقل کی جارہی ہے۔ معلم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیسے مضمون کا علم طلباء کو اجتماعیت کی طرف رغبت دلاسکتا ہے۔

معلم کو ایک ساتھ کئی کردار ادا کرنے ہیں۔ اس کا ایک کردار رہنما کا بھی ہے۔ موجودہ دور میں معلم سے مراد صرف اطلاعات پہونچانے والا آلہ نہیں ہے کیونکہ آج کے تکنیکی دور میں تمام اطلاعات ایک انگشت کی معمولی حرکت سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔ معلم کو ایک دوست، رہنما، فلاسفر، رول ماڈل جیسے رول نبھانے ہیں۔ اس میں ایک اہم رول رہنما (Guide) کا بھی ہے۔ آج کے دور میں طلباء نہ صرف دوران تدریس بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی مختلف مسائل کا سامنا کررہے ہیں۔ معلم ایک رہنما کے طور پر نہ صرف اکتسابی مسائل کا حل فراہم کرسکتا ہے بلکہ ذاتی زندگی میں بھی اگر طلباء کسی پریشانی کا شکار ہوتے ہیں تو ان کا مناسب حل فراہم کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں معلم خود طلبہ کے ذریعے تمام حالات کا تجزیہ کراتے ہوئے نتائج اخذ کرواتا ہے اور اس کی بنیاد پر مسائل سے نبرد آزما ہونے کی راہ بتاتا ہے۔ دور حاضر کے معلم کو حساس ہونا ہوگا اور طلبہ کے مسائل کو ذہن ودل سے سمجھنے میں مہارت بھی پیدا کرنی ہوگی۔

TALMEEZ FATIMA NAQVI
Assistant Professor, CTE Bhopal
Maulana Azad National Urdu University
Email:naqvitalmeez@gmail.com

قرآن مجید سے استفادہ

انس ابو ہریرہ

اللہ تعالی نے اس کائنات کونہایت اہتمام کے ساتھ تخلیق کیا، اور پھر اس میں اپنی ایک اہم اور خوبصورت مخلوق انسان کو بھیجا، اس کے لئے اس کائنات میں ساری سہولیات اور وسائل مہیا کئے، اور اس میں موجود تمام وسائل وذرائع کو استعمال کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ انسان ابتداء سے زندگی گزارنے اور برتنے کے لئے ہدایات خداوندی کا محتاج رہا ہے لہذا اللہ تعالی نے انبیاء ورُسل اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کو بھیج کر انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کی، جب انسانیت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی تو اس نے آخری نبی کے ساتھ اپنی آخری کتاب کو بھیج دیا جو رہتی دنیا تک انسانی زندگی کا دستور بن سکے اور جس کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ ہر زمانے میں اٹھنے والے مسائل اور ہر دور میں پیش آنے والے چیلنجز کا سامنا کر سکے اور ان کا حل پیش کر سکے اور اللہ تعالی نے یہ وعدہ کیا کہ اگر انسان اس کتاب میں مندرج عقائد پر قائم رہے تو یہ کتاب انہیں زمین میں اقتدار بخشے گی اور عزت وسربلندی سے ہمکنار کرے گی ''وَانْتُمُ الْاَعْلَونَ اِنْ کُنتُم مُّؤمِنِین'' (ترجمہ: اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے، سورہ آل عمران، آیت 139)

پروردگار عالم کے اس وعدے کی تصدیق تاریخ اسلام نے کردی۔ چنانچہ چشم فلک نے دیکھا کہ چوپایوں کی گلہ بانی کرنے والی قوم نے اس کتاب سے منسلک ہو کر صدیوں تک قوموں کی جہانبانی کی۔ مگر افسوس! آہستہ آہستہ مسلمانوں نے علم وحکمت کے اس خزانے سے منہ موڑنا اور اس سے پہلوتہی کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بتدریج ان سے عزت وسربلندی سلب کرلی گئی اور ان کی معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی شناخت مسخ ہوگئی۔

کسی قوم کے نوجوان اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کے اجتماعی نظام کے ستون ہوتے ہیں۔ درحقیقت کسی قوم کا عروج وزوال ان ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر امت مسلمہ کے نوجوان قرآن مجید سے استفادہ شروع کر دیں اور اس میں موجود اصول وضوابط کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کرنا شروع کر دیں تو یقیناً امت کی یہ صورتحال تبدیل ہوسکتی ہے اور اسے اس کا کھویا ہوا وقار واپس مل سکتا ہے۔ ذیل میں قرآن مجید سے استفادے کے تعلق سے چند باتیں پیش کی جارہی ہیں جن سے دوران مطالعہ رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے

قرآن مجید سے استفادے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کتاب کتاب ہدایت ہے۔ اس سے ہمیں ہدایت حاصل کرنی ہے۔ اس سے ہمیں شاہراہ حیات پر گامزن ہونے کے لئے رہنما خطوط حاصل کرنے ہیں اور دنیا کی تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نور حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا: ''ذَلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیهِ هُدیً لِّلْمُتَّقِین'' (ترجمہ: یہ کتاب الہی ہے۔ اس کے کتاب الہی ہونے میں کوئی شک نہیں، خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت ہے، سورہ البقرہ، آیت 02)۔ دوسری جگہ مزید تفصیل کے ساتھ فرمایا: ''اِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ یَهْدِی لِلَّتِی هِیَ اَقْوَمُ'' (ترجمہ: بے شک یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے، سورہ بنی اسرائیل، آیت 09)۔ قرآن مجید کے ہر بیان سے ہدایت حاصل کرنا ضروری ہے وہ اقوام وملل کے عبرت انگیز قصے ہوں یا یہود اور منافقین کے مکر اور چالبازیوں کا ذکر ہو یا جنت وجہنم کا ذکر ہو یا مومنین وکفار کی صفات کا ذکر ہو یا اللہ تعالی کی طرف سے بندوں سے خصوصی خطاب ہو، تمام مضامین سے ہدایت حاصل کرنا اور ان سے آگے کی منزلیں طئے کرنا آپ کا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ قرآن کو اگر آپ کسی اور مقصد سے پڑھیں گے تو اس کی روح سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہوگا۔

قرآن مجید کو تمام علوم پر فوقیت حاصل ہے

یہ بات لازماً ذہن میں رہنی چاہئے کہ تمام علوم میں اولیت بہر حال قرآن کو دی جائے گی اور تضاد کی صورت میں بلا چوں وچرا اور بغیر کسی تکلف کے مقابل رائے

کومسترد کردیا جائے گا،خواہ دوسری رائے کتنے ہی اہم اور باوثوق ذرائع سے کیوں نہ حاصل ہوئی ہو۔جدید سائنس کی تحقیقات اگر قرآن مجید کے بیان کی مخالف ہوں تو انہیں یکسر مسترد کردیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس معاملے میں سائنس ابھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکی ہے کیونکہ خالق کائنات کا اس کائنات کے سلسلے میں کوئی بیان غلط اور مہمل نہیں ہوسکتا۔اگر کوئی حدیث قرآن مجید سے ٹکرا رہی ہو اور آیت اور حدیث میں تطبیق کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو قرآن مجید کے بیان کی غیر ضروری تاویل نہیں کی جائے گی بلکہ حدیث پر توقف کیا جائے گا۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی بیان قرآن کے مخالف نہیں ہوسکتا۔قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت مسلک و مشرب کے تعصب سے کنارہ کش اور فرقہ وارانہ ذہن سے پاک ہونا ناگزیر ہے یقینا یہ چیزیں قرآن مجید سے استفادے کی راہ میں حائل ہوں گی۔

قرآن کے مخاطب آپ ہیں

آیات قرآنی کا مخاطب صرف ماضی کے لوگوں کو سمجھ لینے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عہد حاضر کا مسلمان قرآن کے بڑے حصے سے خود کو مستثنیٰ کر لیتا ہے اور مشرکین مکہ، اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور مستضعفین ایمان سے خطاب اور ہلاک کی گئی قوموں کی داستانوں سے سرسری گزر جاتا ہے اور خود کو اس سے الگ سمجھ بیٹھتا ہے۔قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت ذہن میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ اس کی ہر آیت آپ سے متعلق ہے بلکہ آپ ہی کے لئے نازل ہوئی ہے۔ ہر آیت کا مخاطب آپ خود کو سمجھیں۔اگر قرآن میں منافقین کا ذکر ہو اور ان کی خامیاں بیان ہو رہی ہوں تو آپ اپنا جائزہ لیں کہ مبادا یہ خصلتیں خود آپ کے اندر تو موجود نہیں ہیں،اگر ایسا ہے تو انہیں دور کرنے اور مومنین کے لئے بیان کی گئی صفات سے خود کو متصف کرنے کی کوشش میں لگ جانا چاہیے۔انسانوں کی مثبت صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے اور منفی صفات کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔اس طرز عمل کو اپنانے سے کفار سے خطاب آپ کے ایمان اور جذبہ شکر کو مزید مستحکم کرے گا۔مستضعفین ایمان سے خطاب آپ کے ایمان کو مزید تقویت بخشے گا۔یہود و نصاریٰ کی چالبازیاں آپ کے اخلاص وللہیت کو پائیداری بخشیں گی اور ہلاک شدہ اقوام کے داستانیں آپ کو غلبہ وسربلندی سے سرفراز کریں گی اور مومنین سے خطاب آپ کو بحیثیت مجموعی مقاصد حیات،فلسفہ حیات اور دستور حیات سے روشناس کرائے گا اور زندگی گزارنے کے اصول وضوابط اور گائیڈ لائنز بخشے گا۔

قرآن مجید کتاب عمل ہے

دور حاضر میں مسلمانوں کی جانب سے قرآن اور علوم قرآن میں تحقیق اور غور وفکر کے سلسلے میں تو خوب جوش وفکر نظر آتا ہے لیکن کتاب کے اصل مقصد سے بالکل صرف نظر کرلیا جاتا ہے لہذا قرآنی علوم اور احکام کے سلسلے میں تو خوب بحثیں اور گفتگوئیں ہوتی ہیں مگر اسے کتاب عمل کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا، لازم ہے کہ آپ قرآن کو اس نیت سے پڑھیں کہ اس کے ذریعہ سے خداوند عالم ہمیں جو احکام دے رہا ہے اسے ہمیں اپنی زندگی میں نافذ کرنا ہے اور حتی الامکان قرآن مجید کی چلتی پھرتی تصویر بننا ہے۔حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ”کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“ (ترجمہ: قرآن ہی ان کا اخلاق تھا،مسند احمد 24269) یہ قرآن مجید سے عقیدت کی انتہا تھی۔آپ سے بھی اس بات کا مطالبہ ہے کہ آپ کے اخلاق وکردار، عادات واطوار، اور معاملات سے قرآن کی تعلیمات کا عکس جھلکنے لگے۔

قرآن مجید کی روشنی میں اپنا محاسبہ کیجئے

قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت یہ بات مستحضر رہنی چاہیے کہ یہ ایک کسوٹی ہے جس میں آپ کو خود کو پرکھنا ہے، اس آئینے میں آپ کو اپنی تصویر کا جائزہ لینا ہے اور اگر پیشانی پر کوئی داغ نظر آئے تو اسے بہر صورت مٹانا ہے۔اپنا محاسبہ بے لاگ ہونا چاہئے۔اس میں کسی قسم کی رعایت ہرگز نہ کیجئے۔ بلکہ معمولی غلطیوں کا بھی سختی سے نوٹس لیجئے۔اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کیجیے کہ اپنے اعمال زندگی کی وجہ سے کسی پہلو سے آپ قرآن کے منفی گروپ میں تو نہیں شامل ہو رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو قرآن مجید میں دیئے گئے نسخے کی مدد سے اپنی اصلاح کیجیے اور شخصیت میں بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر کو نکال باہر کیجئے۔ انصاف کے ساتھ اپنی ذات کا محاسبہ کیجئے پھر غور کیجئے کہ ہماری صفات مومنین کی صفات ہیں یا راہ راست سے ہٹے ہوئے لوگوں کی؟ اگر جواب منفی ہو تو ان صفات کو مومنین کی صفات سے تبدیل کرنے کی حتی الامکان کوشش کیجئے۔ اگر انصاف کے ساتھ اپنی ذات کا محاسبہ کرکے اس کی اصلاح کرلیں تو یقینا آپ کی زندگی ایک مثالی زندگی بن سکتی ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ اگر ان باتوں کی روشنی میں کیا جائے تو قوی امید ہے کہ اس کتاب سے بڑی حد تک فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔اس کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب کے نزول کا اصل مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ورنہ عین ممکن ہے کہ تمام عمر قرآن مجید میں غور وفکر کرنے کے باوجود پروردگار عالم کے سامنے نبی کریم ﷺ ہمارے تعلق سے یہ کہہ دیں کہ ”یَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا“ (ترجمہ: اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنایا، سورہ الفرقان، آیت 30)

ANAS ABU HURAIRA
Madrasa al Islah, Sarai Meer,
Azamgarh, Uttar Pradesh
Email:anasislahi78@gmail.com

پیشکش: نجم السحر

جرات

یہ کہانی جو میں سنانے جا رہا ہوں بہت پرانی نہیں ہے۔ مارچ کی پندرھویں تاریخ کم از کم نیوزی لینڈ کی عوام نہیں بھول سکتی۔ جمعہ کے اس روز ایک سنکی آسٹریلیائی حملہ آور نے 49 لوگوں کی جان لے لی تھی۔ اس گھناؤنے کام کے لئے اس شخص کو اس کے جسم میں خون کی جگہ دوڑ رہے نسلی عصبیت کے زہر نے تیار کیا تھا۔ لیکن یہ کہانی اس خوفناک حادثے کی نہیں ہے۔ یہ کہانی 17 سال کے ایک ایسے آسٹریلیائی جرات مند لڑکے کی ہے، جو سنکی جارحیت کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ وہ تو ان لوگوں سے بڑھ کر دشمنی مول لیتا ہے جو قتل و غارت گری کی کسی درجہ میں بھی وکالت کرتے ہیں اور اسے ''اگر۔مگر'' کے ساتھ جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہوا یوں کہ نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ میں ہوئے غارت گر حملے کے اگلے ہی روز ایک آسٹریلیائی سینیٹر جس کا نام فریزر اینگ ہے، صحافیوں سے بات کر رہا تھا۔ فریزر آسٹریلیا میں پہلے سے نسلی عصبیت کو بڑھاوا دینے کے لئے مشہور ہے۔ اپنی گفتگو میں اس نے نیوزی لینڈ کے حادثے کو جائز بتانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ''مسلم انتہا پسندوں کا یورپی ممالک میں جس طریقہ سے داخلہ بڑھا ہے اسی وجہ سے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔'' ایک سترہ سال کا لڑکا جس کا نام وِل کنالی ہے، اس کے پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا۔ وِل کے ہاتھ میں مرغی کا انڈا تھا۔ اس نوجوان کو ایسے خونی واقعات کو جائز قرار دینا برداشت نہیں ہوا۔ وہ انڈا اس نے آسٹریلیائی سینیٹر کے سر پر دے مارا۔ یہ کوئی معمولی جرات نہیں تھی۔ وِل کو اس بڑے سیاست دان کے سر پر انڈا مارنے کا انجام معلوم تھا۔ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ لیکن یہ حقیقت خوش کرنے والی ہے کہ نوجوانوں کی ایسی تعداد آگے بڑھ رہی ہے جو نفرت سے نفرت کرتے ہیں۔ جو کشت و خون کو پسند نہیں کرتے اور اس کے خلاف ہر ممکن کاروائی کے لئے تیار رہتے ہیں۔

تعلیم اور انسانیت

''پڑھے لکھے ہو کر ایسی حرکت کرتے ہو!'' یہ جملہ ہر اس موقعہ پر آپ کو سننے کو ملے گا جب آپ سے کچھ ایسا سرزد ہوگا جو پڑھے لکھے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی قاتل ہو سکتے ہیں۔ تو سنیے! ایک اسکول کے پرنسپل جو ہٹلر کے نازی کیمپ سے کسی طرح بچ نکلے تھے انہوں نے لکھا ہے ''میں ہٹلر کے موت والے کیمپ سے بچ کر نکلا تھا اور میری آنکھوں نے وہاں جو دیکھا تھا میں چاہتا ہوں کہ اسے دنیا میں اور کوئی کبھی نہ دیکھے۔ ان بھیانک گیس چیمبرز کو ماہر انجینئروں نے بنایا تھا۔ قابل اور ہنر مند ڈاکٹر ہی وہاں بچوں کو زہر دیتے تھے۔ تربیت یافتہ نرسیں وہاں نوزائیدہ بچوں کو جان سے مارتی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کو کالج سے پڑھے ہوئے گریجویٹ اور ڈگری ہولڈر گولی سے مارتے تھے۔ لہٰذا یہ سب دیکھنے کے بعد اب میں تعلیم کو لے کر بہت کشمکش میں ہوں اور خوفزدہ ہوں۔ میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے طلبہ اور بچوں کی انسان بننے میں مدد کیجیے۔ دھیان رکھئے کہ کہیں آپ کی تعلیم بچوں کو روشن خیال راکشس، ہنر مند نفسیاتی مریض اور قابل پاگل تو نہیں بنا رہی ہے۔ پڑھنا، لکھنا، تاریخ، ریاضی تبھی تک ضروری ہے جب تک وہ طلبہ کے دماغوں میں روشنی اور دلوں میں خوشبو بھرے۔ ان کے اندر انسانوں کی قیمت اور انسانی قدروں کا ارتقاء ہو۔ اگر یہ نہیں ہوتا ہے تو ساری تعلیم بے کار ہے۔''

تبصرہ

کامیابی کے اصول

کتاب کا نام	:	کامیابی کے اصول
مصنف	:	ڈاکٹر آفاق ندیم خاں
صفحات	:	144
سن اشاعت	:	2018ء
قیمت	:	100 روپئے
ناشر	:	ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی
مبصر	:	محمد معاذ

بلندی پر پہنچنے کی آرزو انسان کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر اکساتی رہتی ہے۔ کچھ خوش بخت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کہ بلندیوں پر پہنچ کر ستاروں کی مانند جگمگاتے ہیں جبکہ اکثر کے حصے میں خاک نشینی ہی آتی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں اکثر طلباء و طالبات مستقبل کے خواب بنتے ہیں۔ البتہ ان خوابوں کی عملی تعبیر بمشکل ہی پوری ہو پاتی ہے۔ طلباء و طالبات کی ایک کثیر تعداد شش و پنج کے عالم میں زمانہ طالب علمی کے ایام پوری کرتی ہے اور زندگی کے بقیہ دن کسی ہارے ہوئے شکاری کے مانند گزارتی نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''کامیابی کے اصول'' ان مسافرانِ حیات کے لیے ایک نسخہ ہے جو زندگی کی پیچ و خم راہوں پر حوصلے کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہیں۔ ان طلبہ کے لیے ایک گائڈ لائن ہے جو کہ حصولِ تعلیم کے لیے کوشاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے لیے منشورِ عمل ہے جو کہ اپنی جوانی کو ساری دنیا کے لیے ایک امانت تصور کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف جناب ڈاکٹر آفاق ندیم خاں ہیں، جو کہ خود بھی تعلیم و تدریس کے مقدس پیشے سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر آفاق خاں کے نزدیک کامیابی کے اصول آفاقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جو بھی ان اصولوں کا پاس و لحاظ رکھتا ہے وہ اسے کامیابی کی منزل مقصود تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں کہ جن پر عمل کر کے انسان صحیح معنوں میں ''زندگی'' جی سکتا ہے۔ چنانچہ کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں: ''اگر زندگی میں کامیابی کے اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تو زندگی گزر جاتی ہے لیکن اس کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔'' (ص 08)

عصرِ حاضر میں زندگی کی مہارتوں (Life Skills) کا خاصا چرچا ہے۔ یہ مہارتیں کیا ہیں اور کامیابی سے ان کا کیا تعلق ہے اس موضوع پر کچھ اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں: ''ایسے لوگ ـــــ جو اپنی زندگی مہارت کے ساتھ، اصولوں اور طریقوں کے مطابق گزارتے ہیں، دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابیاں ان کے حصے میں آتی ہیں۔'' (ص 13)۔ کتاب کے ابتدائی مضامین خود آگہی و خود شناسی جیسے موضوعات پر رقم کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کامیابی کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اسی طرح زندگی گزارنے کے لیے اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کیا ہیں؟'' (ص 14)۔ خود آگہی کے لیے تعلیم کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ مصنف کو بھی اصرار ہے کہ علم کی روشنی میں ہی انسان اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے۔ اس اہم نکتہ کو ابتدائی چند مضامین میں واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ''تعلیم کا عمل انسان کو ترقی کے مدارج طے کراتا ہے'' کے زیرِ عنوان ایک اہم بات یہ لکھتے ہیں کہ ''جب انسان اپنی پانچوں حس (آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد) کا استعمال بخوبی سیکھ لیتا ہے تو اس کی چھٹی حس بیدار ہو جاتی ہے اور جب چھٹی حس بیدار ہو جاتی ہے تو انسان اپنی بند آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ سکنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے جو کھلی آنکھ والے بھی نہیں دیکھ پاتے۔'' (ص 24)۔ اس کتاب میں مصنف نے ہدف طے کرنے اور وقت کا صحیح استعمال کرنے پر زور دیا ہے اس سلسلے میں ایک عجیب دعویٰ یہ بھی کرتے ہیں کہ ''نفسیات کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ذہنی انتشار، جذباتی عدم توازن، توجہ کی مرکوزیت میں کمی کی ایک بڑی وجہ ٹیلی ویژن، موبائل اور انٹرنیٹ ہیں، جہاں معلومات ہے لیکن دانشمندی نہیں ہے۔'' (ص 71)۔ مصنف نے یہ دعویٰ اس انداز سے کیا ہے کہ گویا معلومات کی زیادتی ہی عدم دانشمندی کا سبب ہے۔ مصنف کو وا وین میں انٹرنیٹ و ٹیلی ویژن کے صحتمندانہ استعمال کی بھی نشاندہی کر دینی چاہیے تھی۔

کتاب کے آخر میں کچھ متفرق مضامین ہیں جو بس ایک لڑی میں پرو دیے گئے ہیں۔ ان میں کچھ عنوانات کافی اہم ہیں مثلاً ''اپنے بارے میں عمدہ رائے رکھیے''، ''خوش رہنے کی عادت ڈالیے'' اور ''اپنی پسند کا کام تلاش کیجیے۔'' وغیرہ۔ اس مجموعہ کا وصف یہ ہے کہ سارے ہی مضامین ایک نشست میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ عام زندگی کی مثالوں کا بھرپور استعمال مصنف نے بخوبی کیا ہے اور زبان سلیس اور آسان ہے، کتابت کی غلطیاں بہت کم ہیں۔

امید ہے عام قارئین اور طلباء اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔

ایس آئی او کے جنرل سکریٹری بین الاقوامی تنظیم IIFSO کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب

اسلام پسند طلبہ کی بین الاقوامی تنظیم انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشنز (IIFSO) نے گزشتہ 6 اور 7 اپریل 2019 کو Future Change Makers کے عنوان سے ترکی کے تاریخی شہر استنبول میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) کو بھی IIFSO کی رکنیت حاصل ہے۔ لہذا اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ایس آئی او کو بھی مدعو کیا گیا۔ ایس آئی او کے موجودہ جنرل سکریٹری برادار سید اظہرالدین نے اس کانفرنس میں ایس آئی او کی نمائندگی کی۔ IIFSO کی جنرل اسمبلی نشست میں جو 06 اپریل کو منعقد ہوئی، برادر سید اظہرالدین کو IIFSO کی مجلس عاملہ کا رکن مقرر کیا گیا۔ IIFSO طلبہ اور نوجوانوں کی بین الاقوامی تنظیم ہے جس کا قیام 1969 میں عمل میں آیا۔ اس وقت 60 ممالک کی 100 سے زائد اسلامی طلبہ تحریکیں اس فیڈریشن کی رکن ہیں۔ 1977 میں اس نے اقوام متحدہ سے وابستگی اختیار کی۔

برادر سید اظہرالدین نے کانفرنس سے خطاب بھی کیا۔ دوران خطاب انہوں نے ہندوستان میں ایس آئی او کی ہمہ جہت سرگرمیوں پر مشتمل طلبائی جدوجہد کا مختصر تعارف پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ عصر حاضر میں سماج کی تشکیل نو کے لیے طلبہ اور نوجوان کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ کہ اسلام اور اسلام کے ماننے والے اس وقت آزمائشوں کے دور سے گزر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اپنے اپنے ممالک میں ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لیے اپنا تعاون پیش کر سکتے ہیں۔ برادر سید اظہرالدین نے اپنے خطاب میں حسب ذیل چار نکات پیش کیے جن پر عمل کر کے سماج میں امن و انصاف کو قائم کیا جا سکتا ہے:

1۔ عوام کے سامنے بڑے پیمانے پر اسلام کا تعارف اور اسلام کے حوالے سے عوام کے ذہنوں میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ، اسلاموفوبیہ کی تحریک کے سدباب کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔
2۔ ناخواندگی کا خاتمہ اور عوام میں تعلیمی بیداری، یہ ایک ایسا محاذ ہے جس پر توجہ مرکوز کرنے کی ضروت ہے۔ تعلیمی انقلاب کے ذریعے ان پسماندہ طبقات کو باوقار زندگی گزارنے کا موقع میسر آئے گا جو آج بھی اقتدار کے بھوکے حکمرانوں کے جبر کا شکار ہیں۔
3۔ حاشیہ پر رکھے گئے طبقات کو یکساں مواقع فراہم کرنے سے ان کی معاشی حالت میں بہتری آئے گی۔ امن عالم کے لیے معاشی بہتری بھی ایک اہم عامل ہے۔
4۔ موجودہ عالمی سیاست کا مطمح نظر محض اقتدار ہے۔ اقتدار کے حصول کے لیے نام نہاد خودساختہ 'عالمی قائدین' (World Leaders) ملکوں کے درمیان سماجی تانے بانے کو برباد کر رہے ہیں۔ تباہی کے اس سنگین دور میں ہمیں خلیفہ راشد حضرت عمر الفاروقؓ جیسے حکمران کی ضرورت ہے جو اپنی سلطنت کے ہر شہری کے دروازے پر دستک دیتے تھے اور ہر فرد کے مسائل حل کرتے تھے۔

(ادارہ)

ربط

’’رفیق منزل کے ہر شمارے میں مولانا عامر عثمانیؒ کی کم از کم ایک تحریر کو بھی شامل کیا جائے‘‘

حفظ الرحمن (سب ایڈیٹر، راشٹریہ سہارا)

ایک ایسے دور میں جب نوجوان طبقہ مختلف قسم کی لغویات میں غرق ہو، اخلاقیات سسک رہی ہو، ذمہ داری کا احساس دم توڑ رہا ہو، شعور کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہو، ایسی پب جی اور ٹک ٹاک گزیدہ نسل کے چند نوجوانوں کی مشترکہ کاوش ’رفیق منزل‘ زیر مطالعہ ہے رفیق کے مطالعہ سے مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اندھیروں میں امید کی ایک کرن نظر آئی ہے۔ دل کو اطمینان ہوا کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ اب بھی شعور کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے، اب بھی اقدار کو جلا بخشی جاسکتی ہے۔ اب بھی مطالعہ کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خوشی اس بات کی ہوئی رفیق منزل اس طبقہ کی کاوش نہیں ہے جو زہد اور تقوی کی بناء پر خود کو عام طبقہ سے الگ کرلیتا ہے یا ان کیلئے قابل احترام ہوجاتا ہے۔ رفیق منزل ان نوجوانوں کی کاوش ہے جن سے کوئی بھی نوجوان کسی بھی حفظ مراتب کی پرواہ کیے بغیر بے تکلفانہ ماحول میں گفتگو کرسکتا ہے اور اس بے تکلفانہ ماحول میں سوچنے اور سمجھنے کے وہ دروازے بھی کھل جاتے ہیں جو حفظ مراتب کا خیال رکھنے میں شاید نہیں کھل پاتے ہیں۔ المختصر رفیق منزل کی ادارتی ٹیم اور عام نوجوان طبقہ میں ایسی کوئی خلیج نہیں ہے جو عموماً مذہبی حلقوں سے شائع ہونے والے ماہ ناموں کی ادارتی ٹیم اور ان کے قاریوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں رفیق منزل نوجوان طبقہ کی توجہ حاصل کرنے میں خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوسکتا ہے خواہ وہ نوجوان مذہبی ہوں یا لاابالی اور آوارہ! حسن البنا شہیدؒ کہ مطابق یہ آوارہ نوجوان ہی وہ خام مال ہیں جو دین کی طرف متوجہ ہوا تو اپنا سب کچھ اسلام پر قربان کردیں گے۔ ’رفیق منزل‘ ان آوارہ نوجوانوں کو مذہب کی جانب متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے جبکہ روایتی مذہبی شمارے فقہی بحثوں اور لفظی موشگافیوں کی نذر ہوجاتے ہیں جنہیں سمجھنا ان نوجوانوں کیلئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔

رفیق منزل کے مئی کے شمارے میں محمد اکمل فلاحی کی تحریر توبۃ النصوح کی آسان اور عام فہم تشریح ہے اور رمضان المبارک کے دوران توبہ کی ترغیب عام ایام کی بہ نسبت زیادہ بروقت ہے کہ عام دنوں کہ بہ نسبت رمضان کے ایام میں حالت روزہ میں نفس پر قابو پانا آسان ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ تحریر قلوب پر اثر انداز ہوجائے۔ برادرم سعود فیروز اعظمی نے ’رمضان- خیر امت کی تجدید کا مہینہ‘ جیسے مشکل موضوع کو آسان اور عام فہم انداز میں سپرد قرطاس کیا ہے۔ ماضی کی خیر امت بنی اسرائیل کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے حال کی خیر امت کو ان جرائم سے باز رہنے کی تلقین اور بارگاہ ایزدی سے عہد وفا کی تجدید میں ماہ رمضان کے خصوصی کردار کا بحسن خوبی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفعت کی تحریر ’رمضان تقویٰ اور سماج‘ میں ماہ رمضان کے مسلم سماج پر اثرات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تحاریر کا انتخاب بھی بہترین ہے جن پر تفصیلی تبصرہ فی الوقت ممکن نہیں ہے۔ اور نا رسالے کے محدود صفحات اس کی اجازت ہی دیتے ہیں۔

سب سے زیادہ خوشی شمارے میں جتندر رزموہی کے افسانچے کی موجودگی سے ہوئی۔ عموماً مذہبی شماروں میں غیر مسلم قلمکاروں کو شامل کرنے کا رجحان بہت ہی کم پایا جاتا ہے لیکن رفیق منزل کے اس شمارے میں جب قاری بیزار ہونے لگتا ہے اسی وقت جتندر رزموہی اپنے خوبصورت افسانچے اور نجم السحر کی تحریر ’جام وسندان باختن‘ والی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ایس آئی او کے طلباء ماضی میں دیوبند سے نکلنے والے ماہنامہ ’تجلی‘ سے بخوبی واقف ہوں گے لیکن عام طبقہ جو اردو سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہے وہ بھی مولانا عامر عثمانی کے ماہنامہ ’تجلی‘ سے آشنا نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ تجلی کے شمارے نایاب ہوگئے جن میں مولانا عامر عثمانی کی شاندار تحریریں بکھری ہوئی ہیں۔ اگر رفیق منزل کے ہر شمارے میں مولانا عامر عثمانی کی کم از کم ایک تحریر کو بھی شامل کیا جائے تو علم اور ادب کا ایک وسیع سرمایہ جو اب صرف جماعت کی لائبریریوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے، اس تک عام اردو داں طبقہ بھی رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں غور کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ شمارے میں ایک کمی محسوس ہوئی۔ ملک کی سیاسی صورتحال جگ ظاہر ہے۔ مکر وفریب کا بول بالا ہے۔ میڈیا زر خرید غلام بنا ہوا ہے۔ ایسی صورتحال میں کم از کم ایک مضمون ہونا چاہیے جس میں ملک کے سیاسی منظر نامے پر گفتگو کی جائے اور واضح کیا جائے کہ ملک کس سمت جارہا ہے اور اس صورتحال میں عام ہندوستانی کیلئے طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ نئی نسل کی تعمیر میں حالات حاضرہ کا خمیر ضرور شامل ہونا چاہیے جس کے بغیر ایک ایسی نسل تعمیر ہوگی جو جذباتی باتوں، لچھے دار تقریروں اور جھوٹے وعدوں کے فریب میں آئے گی۔ پھر گزشتہ نسل اور نئی نسل میں سیاسی شعور کے معاملے میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

ان سب باتوں کے باوجود ’رفیق منزل‘ کئی معاصر ماہناموں سے بہتر ہے۔ باری تعالی سے دعا ہے کہ رفیق منزل کیلئے وقت دینے والے نوجوانوں کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کی رفاقتوں کو منزلوں کے حصول تک اور اس کے بعد بھی قائم ودائم رکھے۔ آمین

White Dot Publishers

D-300, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi - 110025
wdp@sio-india.org
+91 99 85 45 8236

Cyberistan

Writer : Syed Sadatullah Hussaini
| Price : 40/-

Aasar e Sadaqat

Writer : Muhammad Farooq Khan
| Price : 40/-

Ramzan Guide

Compiled By: Abul Aala Syed Subhani
| Price : 150/-

Huzur (saw) ki Jaddo Jehd ka Markazi Nukta

Writer : Syed Hamid Ali
| Price : 30/-
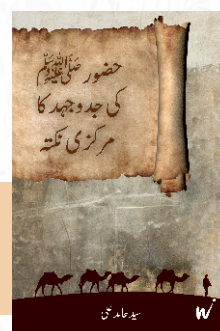
Available on other stores:

Markazi Maktaba Islami Publishers (MMI), New Delhi +91 1126981652
Manshurat Publishers and Distributers, New Delhi +91 98106502289
Hidayat Publishers and Distributers, New Delhi +91 9891051676